اسلام اور معاشرہ

از: علامہ محمد حُسین طباطبائی

پیشکش: سید جہانزیب عابدی

تفسیر المیزان میں سورہ آل عمران کی آخری
آیات کی تفسیر سے اقتباس

بسم الله الرحمن الرحیم

اللّهم صلّ علی محمّد و آل محمّد و عجّل فرجهم

1

اسلامی معاشرہ میں مرابطہ کی اہمیت

اس موضوع کے حوالہ سے ۱۵ عناوین کے تحت بحث ہوگی:

۱۔ انسان اور معاشرہ

۲۔ معاشرہ میں انسان کی نشوونما

۳۔ اسلام اور معاشرہ کے بارے میں اس کی خاص توجہ

۴۔ اسلام میں فرد اور معاشرہ کے درمیان رابطہ کی اہمیت

۵۔ آیا اسلامی معاشرتی اقدار قابل بقاء و اجراء ہیں؟

۶۔ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور تسلسل کی بنیادیں؟

۷۔ دو فکری زاویے: تعقل و احساس

۸۔ خدا سے اجر طلب کرنا اور غیر خدا سے روگردانی

۹۔ اسلام میں آزادی کا معنی و مفہوم

۱۰۔ اسلامی معاشرہ میں حصول کمال کی راہیں

۱۱۔ اسلامی احکامات و دستورات کا عصر حاضر میں سعادت بخش ہونا

۱۲۔ اسلامی معاشرہ کا سربراہ اوراس کا طرز عمل

۱۳۔ اسلامی مملکت کی نظریاتی حدود اور اعتقادی سرحدیں

۱۴۔ اسلام: سراسر معاشرتی جہات کا حامل دین

۱۵۔ اسلام کا پوری دنیا پر یقینی غلبہ

ان موضوعات کے ضمن میں اسلامی معاشرہ میں مرابط اوراس کی اہمیت وآثار پر تفصیلی بحث ملاحظہ ہو۔

۱۔ انسان اور معاشرہ

یہ بات کسی وضاحت اور تفصیلی بحث واستدلال کی محتاج نہیں کہ نوع انسانی فطری طور پر معاشرتی اصولوں پر استوار وقائم ہے، کوئی فرد اس فطری حوالہ سے مستثنیٰ نہیں بلکہ نوع انسانی کا ہر فرد اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور تاریخ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ہر دور میں افراد بشر اجتماعی زندگی بسر کرتے رہے اور قدیم زمانہ کے آثار سے بھی اسی مطلب کا ثبوت ملتا ہے جس میں اس نوع کے افراد باہمی معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور روئے زمین پر ان کے اجتماعی میل جول کے آثار اب بھی تاریخ کے ناقابل انکار حقائق ہیں کہ ان کی بابت قرآن مجید کی متعدد آیات میں نہایت خوبصورت انداز میں بیانات مذکور ہیں مثلاً

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

- ''یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا......''

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا اور تمہیں شعبے اور قبیلے قرار دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو......)

سورۂ زخرف، آیت: ۳۳

- ''نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا''

(ہم ہی نے ان کے درمیان ان کی روزی کو دنیاوی زندگی میں تقسیم کیا اور ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر برتری عطا کی تا کہ وہ ایک دوسرے سے باہم طور پر استفادہ کرسکیں)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

- ''بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ''

(تم ایک دوسرے سے ہو)

سورہ فرقان، آیت: ۵۴

○ "وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا"

وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا، پھر اسے رشتہ دار اور داماد بنایا)

ان کے علاوہ بھی متعدد آیات موجود ہیں جو اس موضوع کے حوالہ سے مربوط مطالب پر مشتمل ہیں، ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ کرنے سے موضوع کی تمام جہات اور مقصودہ معانی واضح طور پر معلوم ہو سکتے ہیں،

۲۔ معاشرہ میں انسان کی نشو ونما

انسانی معاشرہ بھی انسان کی دیگر روحانی صفات اور ان سے مربوط امور کی مانند ہے کہ جو اس کی تخلیق کی ابتدائی گھڑیوں ہی میں کمال کی آخری منزل تک نہ پہنچے تھے کہ اب ان میں نمو اور اضافہ کی گنجائش یا ضرورت نہ پائی جاتی ہو، بلکہ وہ (انسانی معاشرہ) انسان کی دیگر روحانی صفات اور ان سے مربوط امور کی طرح تدریجی طور پر اور رفتہ رفتہ کمال کی جانب رواں دواں رہتا ہے اور یہ سلسلہ انسان کے مادی و معنوی کمالات سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ جاری و ساری رہتا ہے، اس بناء پر یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمام انسانی صفات میں سے صرف یہی ایک صفت یعنی اس کا معاشرت پسند ہونا تکامل اور تدریجی طور پر کمال سے بہرہ مند ہونے کے عمومی نظام سے مستثنیٰ ہو اور اپنے ابتدائے ظہور ہی میں کامل و مکمل ہو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ بھی انسان کی ان دیگر صفات کی طرح ہے کہ جن کا تعلق علم وارادہ سے ہے اور وہ تدریجی طور پر حصول کمال کا سفر طے کرتی ہیں۔

نوع انسانی کے بارے میں اس کے مختلف احوال کے تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلی اجتماعیت جو انسان کی زندگی میں وجود میں آئی وہ ازدواجی بندھن سے حاصل ہونے والی گھریلو معاشرت پر مبنی اجتماعیت تھی کیونکہ اس کا سبب و عامل ایک ایسا امر تھا جس کا تعلق اس کی طبع وجودی سے ہے کہ جو تناسل و توالد کے اعضاء کے تقاضوں سے عبارت ہے اور وہ نہایت مضبوط عامل ہے جو اجتماعیت کو عملی صورت میں لاتا ہے کہ اس کا تحقق پذیر ہونا دونوں کے یکجا ہونے سے ممکن و یقینی ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی ایک، دوسرے کے بغیر اسے وجود میں نہیں لا سکتا یعنی گھریلو اجتماعیت مرد اور عورت دونوں کے باہم طور پر اکٹھا ہونے سے وجود میں آتی ہے جبکہ اس کے برعکس دیگر امور مثلاً کھانا پینا وغیرہ میں دونوں کا باہم ہونا ضروری نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے طور پر غذا کھاتا ہے اور وہ نظام ہاضمہ کے سپرد ہو جاتی ہے اور نظام ہاضمہ اپنا کام کرتا ہے، لیکن تولید نسل کسی ایک فرد کے بس میں نہیں بلکہ دونوں کے ملاپ سے ممکن ہوتی ہے، اور اس گھریلو معاشرہ کی تشکیل کے

بعد جو چیز اس کے تسلسل کی ضمانت بنتی ہے وہ مخصوص صفت وعمل ہے جسے ہم نے سابقہ بحثوں میں ''استخدام'' سے موسوم کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی تمام تر وجودی توانائیوں کو بروئے کار لانے اور قوی ارادہ سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنی ضرورتوں کی تکمیل میں مددگار بنائے، اس کے بعد رفتہ رفتہ دیگر افراد سے کام لیتے ہوئے ایسی صورت حال پیدا کر لیتا ہے کہ خود دوسروں پر حکومت کرنے لگتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے وہ انجام دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کے درمیان رئیس ورعایا کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے اور افراد کی نسبت سے ریاست اور حاکمیت (سرداری) وجود میں آ جاتی ہے مثلاً گھر کا حاکم، قبیلہ کا سردار، خاندان کا سربراہ، امت وملت اور قوم کا سربراہ وغیرہ، تو یہ سب عہدے افراد کے حوالہ سے ہوتے ہیں اور ان میں سے جو تعداد کے لحاظ سے مقدم ہوتا ہے اس کا طاقتور اور بہادر ہونا ملحوظ ہوتا ہے پھر مال واولاد کی کثرت کے حوالہ سے مقدم شخص کو سربراہ قرار دیا جاتا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ انہی معیاروں پر قائم ہوتا ہوا حکومت داری وحکمرانی کے فنی امور کے سب سے زیادہ ماہر شخص تک جا پہنچتا ہے کہ اسے پورے ملک کی سربراہی مل جاتی ہے اور یہ منصب اس کی ماہرانہ صلاحیت کی بناء پر ہوتا ہے کہ پھر وہ تمام رعایا پر حکومت کرتا ہے اور جو کچھ جس سے چاہتا ہے وہ انجام دیتا ہے، اس منصب وعہدہ اور مقام ومنزلت کے دائرہ کی وسعت ہی نے وثنیت وبت پرستی کی راہیں ہموار کیں اور پھر وہ ایک مستقل دین ومذہب کی صورت اختیار کر گئی کہ جواب تک موجود ہے، اس سلسلہ میں تفصیلی بحث آئندہ سطور وصفحات میں کریں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

اور معاشرت واجتماعیت اپنی تمام تر اقسام وانواع کے ساتھ خواہ گھریلو ہو یا دیگر، اگرچہ کسی بھی دور میں نوع انسانی اس سے الگ نہیں رہی بلکہ ہر زمانہ میں یہ سلسلہ قائم رہا لیکن انسان اس کی طرف شعوری توجہ نہ کر سکا اور اس کی تفصیلی جہتوں کی جانب ملتفت نہیں ہوا بلکہ عملی طور پر دیگر امور مثلاً استخدام اور خدمت گیری ودفاع وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت واستحکام میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، یہاں تک کہ ''معاشرہ'' کے وجود کا شعوری وطبعی احساس پیدا ہو گیا۔

قرآن مجید نے بتایا کہ سب سے پہلے اس وقت انسان ''معاشرہ'' کی اہمیت وحیثیت اور اس کے فوائد وآثار سے مطلع وآگاہ ہوا اور اس کی مستقل حیثیت میں حفاظت وپاسداری پر عملی توجہ دینے لگا جب نبوت نے اسے اس حوالہ سے آگاہی دلائی اور معاشرت واجتماعیت کی افادیت سے باخبر کیا، چنانچہ اس سلسلہ میں درج ذیل قرآنی آیات بطور مثال پیش کی جاتی ہیں جن میں معاشرت کی بابت خداوند عالم نے سلسلہ نبوت کی اثر گزاری وعملداری کا تذکرہ کیا ہے۔

سورۂ یونس، آیت: ۱۹

- ''وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا''

(لوگ امت واحدہ تھے، پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۱۳

○ ''كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ''

(لوگ ایک ہی امت تھے، پھر خدا نے انبیاءؑ کو خوشخبری دینے والے اور انذار کرنے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ حق والی کتاب بھیجی تا کہ لوگوں کے درمیان اس چیز کے بارے میں فیصلہ کرے جس میں وہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے باخبر کیا ہے کہ انسان اپنے قدیم ترین ابتدائی ایام میں ایک سادہ امت واحدہ کی صورت میں زندگی بسر کرتا تھا کہ جس کے افراد کے درمیان کوئی اختلاف نہ پایا جاتا تھا اور پھر ان میں اختلافات و نزاعات پھوٹ پڑے تو خداوند عالم نے انبیاءؑ کو بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تا کہ اس طرح ان میں پائے جانے والے اختلاف کو ختم کرے اور انہیں اپنی طرف سے مقرر کردہ قوانین و دستورات کے ذریعے ایک اجتماعی وحدت و معاشرتی یکتائی کی جانب واپس لے آئے۔ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد ہوا:

سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۳

○ ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ''

(اس نے تمہارے لئے وہی دینی احکام مقرر کئے جن کی تاکید نوح کو کی اور تیری طرف اس کی وحی کی اور اس کا حکم ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین پر قائم رہو (دین قائم کرو) اور اس میں تفرقہ و اختلاف پیدا نہ کرو)

اس آیت میں خداوند عالم نے اس حقیقت سے آگاہی دلائی کہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو دور کرنے اور ان کے درمیان وحدت و اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا واحد ذریعہ و وسیلہ ان کے درمیان دین کا قیام اور دین کی بابت عدم تفرقہ ہے، لہٰذا دین ہی ہے جو انسانی معاشرہ کی بہتری و بھلائی کا ضامن ہے۔

اور یہ آیت مبارکہ...... جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں...... سب سے پہلے اس دعوت یعنی اجتماعیت و معاشرت اور اتحاد کی دعوت کے حوالہ سے حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کر رہی ہے کہ جو قدیم ترین انبیاءؑ میں سے تھے اور صاحب شریعت اور صاحب کتاب تھے (انہیں شریعت اور کتاب عطا کی گئی تھی) پھر حضرت ابراہیمؑ، پھر حضرت موسیٰؑ اور آخر میں حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ کر رہی ہے جبکہ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی شریعتیں معدودے چند احکام پر مشتمل تھیں اور مذکورہ بالا چار انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت موسیٰؑ کی شریعت سب سے وسیع تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی شریعت بھی انہی (حضرت

موسیٰ ؑ) کے تابع تھی جیسا کہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں آگاہ کیا ہے، اور موجودہ انجیلوں میں بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، اور جب حضرت موسیٰ ؑ کی شریعت کے بارے میں بھی یہی کہا گیا کہ اس میں تقریباً چھ سو احکام کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

بنابرایں واضح ہوا کہ اجتماعیت و معاشرتی زندگی کی دعوت مستقل صورت میں صرف نبوت کے ذریعے انجام پائی اور انبیاء علیہم السلام نے اسے دین کے قالب میں پیش کیا چنانچہ قرآنی آیات میں اس کا صریح بیان موجود ہے اور تاریخ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، کہ اس سلسلہ میں عنقریب مزید مطالب تاریخی بحث میں پیش ہوں گے۔

۳۔ اسلام کی معاشرتی امور پر خصوصی توجہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے اپنی تعلیمات کی اساس و بنیاد صریح طور پر معاشرہ و معاشرتی زندگی پر قائم کی ہے۔ اور اس نے کسی بھی حوالہ سے معاشرتی امور کو بے اہمیت و نظر انداز نہیں کیا، اگر آپ اس سلسلہ میں مزید آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہوں تو سب سے پہلے انسانی اعمال کے وسیع دائرہ پر نگاہ کریں اور ان کی یہ گوناگوں قسموں، شعبوں اور انواع و اصناف کو دیکھیں کہ جس کو شمار کرنا انسانی قوت فکر کے بس کا روگ نہیں، پھر آپ شریعت اسلامیہ میں ان اعمال کے شمار کیے جانے اور پوری طرح ان کو ملحوظ و مدنظر قرار دے کر ان سب کی بابت احکام و دستورات وضع و معین کرنے پر توجہ کریں اور پھر ان تمام احکام کو معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کے نہایت ظریفانہ عمل پر نظر کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے معاشرت کی روح کو اپنے احکام میں ممکنہ حدود تک نافذ کیا ہے یعنی جہاں تک ممکن تھا اسلام نے اپنی تعلیمات میں معاشرت کی روح پھونکی اور ان کی عملی تطبیق کی ہر ممکن صورت پیش کر دی۔

اس کے بعد آپ ان احکام کا دیگر ان آسمانی شریعتوں سے موازنہ کریں جن کے بارے میں قرآن مجید نے خصوصی طور پر اہمیت کے ساتھ آگاہ کیا ہے یعنی حضرت نوح ؑ، حضرت ابراہیم ؑ، حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ کی شریعتیں، تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے درمیان کیا نسبت پائی جاتی ہے اور اس نسبت کے تناظر میں شریعت اسلامیہ کا مقام و منزلت کیا ہے!

جب شریعت اسلامیہ اور ان شریعتوں کے درمیان نسبت و مقام کی صورت یہ ہے تو ان شریعتوں کے حوالہ سے اس کا مقام و امتیازی بلند مرتبہ کس قدر ہو گا جن کی بابت قرآن مجید نے خاص توجہ و عنایت کی ہی نہیں مثلاً بت پرستوں، صابئوں، مانویوں اور مجوسیوں وغیرہ کی شریعتیں! ان کی بابت صورتحال واضح و روشن تر اور آشکار ہے۔

اور جہاں تک متمدن قوموں اور غیر متمدن قوموں کا تعلق ہے تو تاریخ نے ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ

نہیں بتایا کہ وہ صرف انہی چیزوں کی عملی پیروی کرتے تھے جو انہیں عہد قدیم سے وراثت میں ملیں یعنی دوسروں کی توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرتی امور کی انجام دہی کو یقینی بنانا اور استبدادی حکومت و بادشاہت کی بنیاد پر قائم آمریت کے تحت اجتماعی و معاشرتی زندگی بسر کرنا، تو ان دو عوامل کی بنیاد پر ان کا معاشرہ قوم، وطن اور علاقہ کے حوالہ سے پہچانا جانے لگا یعنی اس میں حاکمیت و آمریت اور ریاست و بادشاہت ہی اصل و اساس تھی اور اس کے طور و اطوار اور طرز عمل موروثی اقدار و اصول اور علاقائی رسم و رواج ہی سے وابستہ تھے۔ اسی وجہ سے ان امتوں میں سے کوئی امت اپنے استقلال کو درخور اعتناء قرار نہ دیتی تھی اور نہ ہی اسے بحث و عمل کا موضوع قرار دیتی تھی، یہاں تک کہ ان امتوں کی روش بھی یہی تھی جو نامور اور دنیاوی حکمرانی کے حوالہ سے بڑی طاقتیں (سپر پاورز) کہلاتی تھیں کہ انہوں نے بھی دین کی روشنی کے پھیل جانے اور اس کے روم و فارس کی سلطنتوں کی سرحدیں عبور کر جانے کے باوجود اپنی معاشرتی حیثیت کے بارے میں غور و فکر نہ کیا بلکہ انہی قیصری و کسروی آمریتوں کے نظام سے وابستہ رہ کر معاشرتی زندگی بسر کرتے رہے اور ان کی ترقی و پستی انہی آمرانہ نظاموں سے وابستہ رہی کہ جب وہ امپراطوری و سلطنتی نظام مضبوط ہوتا تو معاشرہ بھی مضبوط ہو جاتا اور جب اس میں کمزوری آتی تو معاشرہ بھی کمزور پڑ جاتا۔..... گویا معاشرہ کی حیثیت و وقار آمریت کی قوت پر موقوف تھا نہ کہ افراد کی انسانی عظمت و عقلی و فطری معیاروں پر!..... البتہ ان کی موروثی تحریروں میں ان کے حکماء و فلاسفہ مثلاً سقراط، افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے نوشتہ جات اجتماعی و معاشرتی امور کی بابت علمی بحثوں کے حامل نظر آتے ہیں لیکن وہ سب کاغذی مجموعوں سے زیادہ کوئی عملی حیثیت نہیں رکھتے اور کسی دور میں ان کی عملی صورتیں مشاہدہ میں نہیں آئیں بلکہ وہ فکر و ذہن کی حدود سے نکل کر حقیقی صورتوں اور عملی قالب میں ڈھلی ہی نہیں چنانچہ ان کی موروثی تاریخ اس سلسلہ میں ہمارے موقف اور بیان کردہ مطالب پر نہایت واضح اور عادل ترین گواہ ہے۔

بنابرایں سب سے پہلی ندا جو نوع انسانی کو سنائی دی اور اس نے افراد بشر کو معاشرتی زندگی کے امور کو اہمیت کی نظر سے دیکھنے اور اسے ہر طرح کے اہمال و بے توجہی اور اندھی تقلید سے پاک معاشرہ کی تشکیل کو مستقل موضوع قرار دینے کی ضرورت پر زور دیا وہ پیامبر بزرگوار اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی صدائے حق تھی کہ جس میں آنحضرتؐ نے لوگوں کو ان آیات الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جن میں ان کی دنیاوی زندگی کی سعادت مندی اور معاشرتی زندگی کی پاکیزگی سے بہرہ مند ہونے کے زریں اصول پائے جاتے ہیں ان آیات میں سے چند درج ذیل ہیں:

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۳

○ "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ"

(اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس تم اسی کی پیروی کرو اور دیگر راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تمہیں پراگندہ کر دیں گے)

سورۂ آل عمران، آیات: ۱۰۳ تا ۱۰۵

- وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۗ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو اور آپس میں فرقہ بندی نہ کرو، اور تم اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم باہمی دشمنی کا شکار تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی کہ پھر تم اس کی نعمت کے طفیل آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اور تم جہنم کی آگ کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے نکال کر بچا لیا، اس طرح اللہ تمہیں اپنی آیات کی کھلی وضاحت کرتا رہتا ہے تا کہ تم ہدایت یافتہ رہو، اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں (اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں)...... اس میں معاشرہ کو تفرقہ و گروہ بندی سے بچانے کا اشارہ ہے...... اور وہی کامیاب ہیں، اور تم ان لوگوں جیسے نہ بنو جنھوں نے تفرقہ اندازی کی اور واضح نشانیاں و دلائل آ جانے کے باوجود اختلاف کیا کہ وہی ہیں جن کے لئے بہت بڑا عذاب مقرر ہے)

سورۂ انعام، آیت: ۱۵۹

- ''اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ''

(جن لوگوں نے اپنے دین میں گروہ بندیاں کیں اور فرقوں میں بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں)

ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات میں اجتماعی و معاشرتی زندگی اور باہمی اتفاق و اتحاد کی دعوت دی گئی ہے مثلاً

سورۂ حجرات، آیت: ۱۰

- ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ''

(یقیناً! اہل ایمان آپس میں بھائی ہیں، پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاحی عمل انجام دو)

سورۂ انفال، آیت: ۴۶

- ''وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ''

(اور تم آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ بکھر جاؤ گے اور تمہاری عزت برباد ہو جائے گی)

سورہ آل عمران، آیت: ۱۰۴

○ ''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ''

(اور ضروری ہے کہ تم میں سے ایک قوم ایسی ہو جو نیکی کی طرف دعوت دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کام سے روکیں)

ان آیات کے علاوہ دیگر متعدد آیات ایسی ہیں جن میں ایسے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا صریح حکم دیا گیا ہے جس کی بنیاد اتفاق و اتحاد پر قائم ہو اور اس میں افراد کے معنوی و مادی فوائد کی بھرپور ضمانت پائی جاتی ہو اور اس سے دفاع کی تمام تر تدبیریں موجود ہوں تاکہ اس کے ذریعے ہر فرد اپنی سعادتمند زندگی سے بہرہ ور ہو سکے۔ ہم اس سلسلہ میں عنقریب وضاحت کے ساتھ بعض مربوط مطالب پیش کریں گے۔

۴۔ فرد اور معاشرہ کے درمیان روابط کا اسلامی امتیازی نقطہ نظر

کارخانہ تخلیق کی یہ روش عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اجزاء کو وجود عطا کرتا ہے کہ ان میں سے ہر جزء مخصوص آثار و خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، پھر ان میں سے چند اجزاء کو ان کے درمیان مختلف و متعدد حوالوں سے فرق و تفاوت پائے جانے کے باوجود باہم اکٹھا کر کے انہیں ایک مجموعہ مرکب کی صورت میں لاتا ہے، پھر ان میں سے ہر ایک میں پائے جانے والے فوائد کے ساتھ ساتھ دیگر نئے فوائد سے استفادہ کرتا ہے۔ مثلاً انسان کہ جو متعدد اجزاء و اعضاء رکھتا ہے اور گوناگوں قوتوں کا حامل ہے کہ جن میں مادی و روحانی فوائد کا ایک خزانہ پایا جاتا ہے کہ اگر وہ یکجا ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک قوی تر اور عظیم تر ہو جاتا ہے اور وہ سب بھاری بھرکم مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ان میں سے ہر جزء جس طرح انفرادی حیثیت میں اپنی مخصوص قوتوں کا حامل تھا اسی طرح مجموعی حیثیت میں بھی نہایت طاقتور ہو جاتا ہے کہ پھر ہر طرح کی حرکت و تحرک اور عملداری کی تمام جہتیں اجتماعی قوت پیدا کر لیتی ہیں، لیکن اگر وہ یکجا نہ ہوں اور ایک مجموعہ مرکب کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ ہر قوت اپنی انفرادی و متفرق حالت پر باقی رہ جائے مثلاً سننے کی طاقت، دیکھنے کی طاقت، چکھنے کی طاقت، چاہنے کی طاقت اور کچھ کرنے کی طاقت، (کان، آنکھ، ذائقہ، ارادہ، حرکت) تو یہ طاقتیں اپنی اپنی حیثیت میں اپنا کام کرتی ہیں مگر ان سب کا انسانی وجود میں ایک ترکیبی اکائی کی صورت میں قرار پانا انہیں ایک حاکم یعنی انسان کے تسلط کے وجودی نظام سے منسلک کر دیتا ہے تو اس صورت میں جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ترکیبی اکائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے، یعنی ان میں سے ہر قوت اپنی انفرادی صورت میں جن فوائد کی حامل ہے وہ اسی دائرہ میں محدود رہتی ہے لیکن ترکیبی اکائی پانے کی

صورت میں ان میں سے ہر جز کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے، اور ترکیبی اکائی کے فوائد بہت زیادہ ہیں مثلاً فعل، انفعال، روحانی فوائد، مادی فوائد، اور ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ ترکیبی اکائی کے نتیجہ میں ایک فائدہ، متعدد فوائد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے یعنی اپنی وحدت میں کثرت کا حامل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی مادہ مثلاً نطفہ جب اپنی نشوونما کے مراحل مکمل کر لیتا ہے اور مکمل انسان بن جاتا ہے تو اس بات پر قادر ہو جاتا ہے کہ خود اپنے ہی مادہ میں سے کچھ الگ کر کے اس کی تربیت کرے اور اسے ایک مکمل انسان کی صورت میں لے آئے کہ جو اسی طرح کے افعال انجام دے جس طرح کے افعال وہ خود انجام دیتا تھا اور تمام مادی و روحانی افعال میں اس جیسا ہو جائے، بنابراین تمام افراد و بشر اپنی کثرت کے باوجود وحدت رکھتے ہیں یعنی کثیر افراد در حقیقت ایک ہی انسان ہے اور اس کے افعال تعداد کے لحاظ سے ”کثیر“ مگر نوع کے اعتبار سے ”واحد“ ہیں اور وہ سب پانی کی طرح یکجا و مرکب ہوتے ہیں کہ جس طرح پانی ایک حقیقت واحدہ رکھتا ہے مگر جب اسے برتنوں میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ ایک سے زیادہ ہو جاتا ہے اور اس کی کثرت کا سرچشمہ ایک ہی نوع ہوتی ہے، یعنی وہ سب پانی اگرچہ مختلف و متعدد برتنوں میں آنے کے حوالہ سے کثیر ہیں مگر نوعی حقیقت کی بنیاد پر واحد ہیں اور اپنی نوعی وحدت کے باوجود ان کے آثار و خواص میں کثرت پائی جاتی ہے لیکن جب وہ سب پانی یکجا ہو جائیں تو ان میں قوت و عظمت پیدا ہو جاتی ہے، اسی مطلب کو اسلام نے اس نوع کے افراد کی تربیت اور انہیں حقیقی سعادت کی طرف ہدایت و رہنمائی کرنے میں ملحوظ قرار دیا ہے اور اسے بنیادی اہمیت کا حامل بنایا ہے اور اسی حقیقت کو اصل و اساس قرار دیا ہے کیونکہ اس کو بنیادی حیثیت دینا ناگزیر ہے، اسی سلسلہ میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ فرقان، آیت: ۵۴

- ”وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا“

(وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا اور اسے نسب و خاندان اور سسرالی نظام کا محور قرار دیا)

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

- ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى“

(اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

- ”بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ“

(تمہارے بعض، بعض سے ہیں، (تم ایک دوسرے سے ہو)

اور فرد اور معاشرہ کے درمیان پایا جانے والا یہ حقیقی رابطہ لامحالہ ایک ایسی معاشرتی صورت اختیار کر لیتا ہے جو افراد

کے وجود، ان کی قوتوں، ان کی خصوصیات اور ان کے عملی آثار کی بناء پر مخصوص کیفیت کی حامل ہوتی ہے اور پھر ''معاشرہ'' کے نام سے ایک ایسی اکائی وجود میں آجاتی ہے جو ہر فرد کی خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس میں اجتماعی قوت جلوہ گر ہوتی ہے، اسی بناء پر قرآن مجید نے امت کے لئے وجود، اجل، کتاب، شعور، فہم، عمل اور اطاعت و معصیت کے حوالے قرار دیئے اور انہیں کے تناظر میں اس کا تذکرہ کیا، چند آیات بطور مثال ملاحظہ ہوں:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۴

- ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ''

(اور ہر امت کے لئے ایک اجل (مقررہ وقت) ہے کہ جسے وہ نہ تو مؤخر کر سکتے ہیں اور نہ ہی مقدم کر سکتے ہیں)

اس آیت میں ہر امت کے مقررہ وقت کا حوالہ ملحوظ ہے۔

سورۂ جاثیہ، آیت: ۲۸

- ''كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا''

(ہر امت کو اس کی کتاب کی طرف بلایا جائے گا)

یہ آیت ہر امت کی مخصوص کتاب کے حوالہ کی طرف توجہ دلا رہی ہے،

سورۂ انعام، آیت: ۱۰۸

- ''زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ......''

(ہم نے ہر امت کے لئے ان کے اعمال کو زینت قرار دیا......)

اس آیت میں امت کے اعمال کا حوالہ ملحوظ قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ مائدہ، آیت: ۶۶

- ''مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُقْتَصِدَةٌ''

(ان میں سے بعض امتیں درست راستہ پر ہیں)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۱۳

- ''أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ''

(امت قائم و ثابت قدم، وہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔)

سورۂ غافر، آیت: ۵

- ''وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ ۖ وَجَادَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ''

(ہر امت نے اپنے رسول کو اپنے زیر تسلط کرنے کی کوشش کی اور باطل کے ذریعے مجادلہ و جھگڑا کرنے لگے تا کہ

اس طرح حق کا نام مٹادیں، تو ہم نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر کس قدر سخت عذاب میں مبتلا کردیا)
سورۂ یونس، آیت: ۴۷

O ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ''

(اور ہر امت کے لئے ایک رسول آیا تو جب بھی ان کا رسول آیا تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کیا گیا)

ان آیات کی روشنی میں یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید افراد کے حالات و واقعات کو ان کی انفرادی زندگی کے حوالہ سے جس طرح اہمیت کی نظر سے دیکھتا ہے اسی طرح امتوں کی تواریخ کو بھرپور بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے کیونکہ عام طور پر مشاہدہ میں آیا ہے کہ تواریخ کا محور بادشاہوں اور بڑے لوگوں کے حالات کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا اور مورخین، نزول قرآن کے بعد امتوں اور معاشروں کے حالات و واقعات قلمبند کرنے کی طرف راغب ہوئے اور پھر اس سلسلہ میں ان میں سے بعض حضرات نے کچھ عملی اقدامات بھی کئے جن میں مسعودی اور ابن خلدون شامل ہیں، اور پھر تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ افراد کے حالات قلمبند کرنے کے مراحل سے گزرتا ہوا امتوں کی تواریخ رقم کرنے تک پہنچ گیا اور یہ بات اس حوالہ سے ایک بڑی تبدیلی قرار پائی، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس نے قدم بڑھایا وہ فرانسیسی مورخ (اگوست کنت) متوفی ۱۸۵۷ء ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جب فردی قوتوں و خصوصیات کا اجتماعی قوتوں وخصوصیات سے تقابل وتعارض اور تضاد ہو تو اجتماعی قوتیں وخصوصیات ہی غالب و مافوق ہوں گی اور ایسا ہونا دو متضاد چیزوں کے درمیان لازمی امر ہے، اس کے ساتھ ساتھ مشاہدہ وتجربہ سے بھی اس حقیقت کی گواہی ملتی ہے کہ اجتماعی قوتیں وخصوصیات فعل وانفعال یعنی اثر گزاری واثر پذیری دونوں صورتوں میں فردی قوتوں وخصوصیات پر غالب آتی ہیں چنانچہ ہر کام میں یہ بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ اجتماعی کوشش وارادہ کے سامنے فردی کوشش وارادہ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی، اس کا ثبوت جنگوں اور اجتماعی حملوں میں بخوبی نظر آتا ہے کہ ایک فرد خواہ جس قدر قوی وطاقتور ہو اجتماعی حملوں کا مقابلہ اس کے بس کا روگ نہیں ہوتا، بلکہ ''جزء'' کے لئے ''کل'' کے ساتھ ساتھ چلنے اور اس کی راہ اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ ''کل'' یعنی معاشرہ اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے کہ اپنے ہر ''جزء'' یعنی ہر فرد کی شعوری وفکری قوتوں کو سلب کر دیتا ہے کہ پھر ہر فرد کی انفرادی حیثیت باقی ہی نہیں رہتی بلکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ معاشرہ ہوتا ہے، اسی طرح کی صورت حال عمومی خوف وہراس اور دہشت ودحشت گری میں ہوتی ہے جیسا کہ جنگ میں شکست، عمومی بدامنی، زلزلہ، قحط و وبا یا علاقائی رسم ورواج اور قومی اطوار وعادات وغیرہ فرد کو معاشرہ کی پیروی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس سے فکر وادراک

کی قوتیں سلب کر لیتی ہیں۔

اسی بناء پر اسلام نے اجتماع و معاشرہ کو اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے اور اس طرح اہمیت عطا کی ہے کہ نہ تو اس قدر اہمیت اس سے پہلے اسے حاصل ہوئی اور نہ آئندہ اس کی مثال کسی بھی دین و آئین، اور مذہب وملت میں اسے حاصل ہو سکتی ہے (عین ممکن ہے کہ قارئین کرام ہمارے اس ادعا کو تسلیم نہ کریں) یہ حقیقت واضح ومسلم الثبوت ہے کہ اسلام کا معاشرہ اور معاشرتی اقدار کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا اس حوالہ سے اپنی مثال آپ ہے کہ کسی فرد میں اخلاقی تربیت وصفاتی کمالات کا پایا جانا جو کہ معاشرہ کی تشکیل میں اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود معاشرہ میں پہلے سے موجود ان اخلاقی وصفاتی اقدار کا مقابلہ نہایت معمولی اور نا قابل قیاس حد سے زیادہ نہیں کر سکتا جو اعلیٰ و بلند پایہ مقامات سے متصادم ہوتی ہیں اور ان میں معاشرتی قوت کی بناء پر اثر آفرینی کا دائرہ وسیع تر ہوتا ہے، یعنی معاشرہ میں پائی جانے والی منفی صفات اور اخلاقی جہات اس قدر طاقتور ہوتی ہیں کہ فردی صفات کا ان سے تقابل نا قابل قیاس اور نہایت معمولی ہوتا ہے، اسی حوالہ سے اسلام نے اپنی اہم ترین تعلیمات اور احکام و دستورات مثلاً حج، نماز، جہاد و انفاق اور دینی تقویٰ کو معاشرہ کی بنیاد پر استوار کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی تمام قوتوں کو دینی احکام و دستورات اور ان کی حدود کے تحفظ کا ذمہ دار قرار دے کر اور تمام افراد امت پر دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عمومی فریضہ عائد کر کے اسلامی معاشرہ کی اصل غرض ومقصد حقیقی سعادت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرب و منزلت کو قرار دیا، اور صرف اسلامی معاشرہ ہی نہیں بلکہ ہر معاشرہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی مشترکہ غرض ومقصد سے بے نیاز نہیں ہوتا لہٰذا ہر معاشرہ میں اصل غرض حقیقی سعادت ہی ملحوظ قرار پاتی ہے، اور یہی چیز بنیادی طور پر ہر فرد کے باطن میں ایک نگران کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس سے انسان کے باطنی اسرار پوشیدہ نہیں رہ سکتے، اور جب باطنی اسرار مخفی نہیں رہ سکتے تو ظاہری اعمال تو ویسے بھی ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ حکومتی ادارے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے حضرات پر کسی کے باطنی اسرار آشکار نہیں ہوتے اور وہ ان سے آگاہی حاصل کرنے سے قاصر ہوتے ہیں بہر حال یہی عمومی معاشرتی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی تقویٰ، اسلام کو دیگر ادیان و مذاہب اور ہر معاشرتی نظام سے ممتاز و مافوق کرتا ہے کہ اس طرح سے معاشرہ کی اصلاح و بہتری اور پاکیزگی کا نظام و اہتمام کسی دوسرے دین و آئین میں دکھائی نہیں دیتا۔

۵۔ آیا اسلامی معاشرتی اقدار قابل بقاء و اجراء ہیں؟

قارئین کرام، ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ معاشرتی اقدار حقیقی معنی میں دیگر تمام ادیان و

مذاہب اور متمدن ترین اقوام کے معاشرتی اصولوں کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور مضبوط ہوتے تو معاشرے میں ان کی بقاء و اجراء کی مدت زیادہ ہوتی جبکہ صورت حال اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے تو ایسا کیوں ہوا؟ اور اسلامی معاشرتی اصولوں کو زیادہ پذیرائی حاصل کیوں نہیں ہوئی؟ بلکہ نہایت قلیل عرصہ ہی ان کے اجراء کو حاصل ہو سکا اور پھر اسی قیصریت و کسریت ہی کو حاکمیت حاصل ہوئی جو پہلے تھی، بلکہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ مخدوش اور ناگفتہ بہ ہوگئی اور امپراطوری و بادشاہت کے شاخسانے پیدا ہو گئے اور ایسے حالات سامنے آئے کہ سابقہ امپراطوری نظاموں میں بھی نہ دیکھے گئے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں مغربی معاشرتی نظاموں کو بقاء و استحکام حاصل ہوا اور ان کی بنیادیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ مغربی معاشرتی اصولوں کو زیادہ ارتقاء و استحکام حاصل ہے اور معاشرے میں ان کی عملداری و اجراء کی بنیادیں مضبوط و قوی تر ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل مغرب نے اپنے معاشرتی اصولوں کو عوام الناس کے ارادہ و خواہش اور ان کی چاہتوں و طبعی تقاضوں کی بنیادوں پر استوار کیا اور پھر ان میں اکثریت کی خواہشوں اور آراء و تجاویز کو معیار قرار دے دیا کیونکہ معاشرے کے تمام کے تمام افراد کا یکجا ہونا اور ایک ہی رائے و نظریہ پر متفق ہو جانا عام طور پر محال و ناممکن ہے جبکہ اکثریت ہی کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اسی پر معاشرے کے عمومی نظام کا دارومدار قرار پاتا ہے چنانچہ ہم مادی و طبعی علل و اسباب میں سے ہر ایک کو اکثر و بیشتر مؤثر پاتے ہیں البتہ ہمیشہ اور دائمی طور پر نہیں (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سب کے سب ہر صورت میں اور ہمیشہ ہی مؤثر واقع ہوں) یہی حال ان عوامل کا ہے جو ایک دوسرے سے مختلف و متصادم ہوتے ہیں کہ وہ بھی اکثر ہی مؤثر واقع ہوتے ہیں یعنی نہ تو سب کے سب اور نہ ہی قلیل ترین! اسی وجہ سے موزوں یہ ہے کہ معاشرتی نظام کی تشکیل، اصل غرض و مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور معاشرے میں رائج و نافذ العمل قوانین کے حوالہ سے اکثریت کی آراء پر استوار ہو، اور جہاں تک نظریہ دینی نظام معاشرت کا تعلق ہے تو اسے ایک خالی و خیالات آرزو سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل نہیں کہ جو موجودہ دور میں عملی صورت میں ڈھل نہیں سکتی بلکہ ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کا دائرہ ذہن کی دنیا سے باہر نہیں، جبکہ اس کے برعکس عصر حاضر کے تمدنی نظام نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں معاشرہ کی طاقت و سعادت کے ساتھ ساتھ افراد کی پاکیزگی اور ان کا رزیلتوں اور ناپاک صفات و اعمال سے پاک ہونا یقینی بنا دیا ہے کیونکہ رزیلتیں اور ناپاک صفات و اعمال ایسے امور ہیں جن کو معاشرہ ہرگز پسند نہیں کرتا مثلاً جھوٹ، خیانت، ظلم، چوری، بے وفائی وغیرہ۔

یہ مطالب ان خیالات و افکار کا خلاصہ ہے جو ہمارے مشرقی محققین بالخصوص ہمارے ان فاضل دانشوروں کے اذہان میں پیدا ہوئے ہیں جو معاشرتی و نفسیاتی مسائل میں بحث و تحقیق میں سرگرم عمل رہتے ہیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان حضرات نے مطالب کو بیجا مقامات میں پیش کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ حقیقت الامر کے سمجھنے میں خلط ملط کا شکار ہو گئے اس کی وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ اسلامی نظام معاشرت موجودہ زمانہ میں رائج تمدن کے مقابلے میں ناقابل عمل ہے کیونکہ دنیا کے موجودہ حالات اسلامی قوانین سے ہم رنگ نہیں، تو یہ درست ہے لیکن اس سے ان کا مطلوب ثابت نہیں ہوتا کیونکہ انسانی معاشرے میں رائج ہر نظام واصول ہی ایسا ہے جو نو پید اور جدید الحدوث ہے یعنی پہلے موجود نہ تھا اور پھر وجود میں آیا، اور جب وجود پذیر ہونے لگا تو معاشرہ کے عمومی حالات اس سے ہم رنگ وہم آہنگ نہ تھے بلکہ اس سے متصادم اور اسے مسترد کر رہے تھے، مگر اس کے باوجود جدید الحدوث نظام نے حالات کا بھرپور مقابلہ کیا اور کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی سے دو چار ہونے کے ساتھ ساتھ بالآخر کامیابی حاصل کر کے معاشرے میں رائج قدیم تمدن پر غلبہ پا گیا کہ جس کے نتیجہ میں قدیم تمدن کو جڑ سے اکھاڑ دیا، البتہ ایسا بھی ہوتا رہا کہ معاشرہ میں رائج قدیم تمدن اس قدر مضبوط تھا کہ اس نے جدید نظام کو نہ پہنچنے دیا اور اس کا راستہ روک دیا، لیکن اس طرح کی سرد اور گرم جنگ کے بعد بالآخر معاشرے میں اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں یہاں تک کہ اس کا تسلط پورے معاشرہ پر یقینی ہو گیا، چنانچہ اس کی مثالیں دینی و دنیوی تمام نظاموں کے حوالہ سے تاریخ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں مثلاً پہلی عالمی جنگ کے بعد ڈیموکریٹک نظام (کہ جو عصر حاضر میں سب سے زیادہ پسندیدہ نظام قرار دیا گیا ہے) روس میں اپنی شکل کھو بیٹھا اور ایک اشتراکی وکمیونسٹی نظام میں تبدیل ہو گیا، اور دوسری عالمی جنگ کے بعد مشرقی یورپ کے ممالک اور مملکت چین نے بھی روس کے ساتھ الحاق کر لیا جس سے دنیا کی نصف آبادی میں ڈیموکریسی نظام بے وقعت ہو گیا چنانچہ ایک سال پہلے کی بات ہے (تالیف کتاب کے حساب سے) کہ کمیونسٹ ممالک نے اعلان کیا کہ ان کے قائد آنجہانی اسٹالین نے اپنی حکومت کے دوران یعنی لینن کی حکومت کے تیس سال بعد اشتراکی نظام کو شخصی واستبدادی نظام میں بدل دیا اور آج تک صورتحال یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کے شیفتہ ہوتے ہیں اور پھر اس سے روگردانی کر لیتے ہیں اور کچھ لوگ اس سے روگردانی کے بعد اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں، بہر حال تاریخ میں اس طرح کے شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس طرح کے نظریاتی نشیب وفراز کی داستانوں کے حوالہ سے قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوا: ''قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ '' (تم سے پہلے بھی بہت سے نظام گزر چکے ہیں، تم زمین میں گھومو پھرو، اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟...... سورۂ آل عمران ۳ / ۱۳۷......، اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نظام جو آیات الٰہی کی تکذیب پر قائم ہو وہ کسی اچھے انجام کو نہیں پہنچتا۔

ان مطالب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی نظام کا معاشرے کے موجودہ ومعروضی حالات سے مطابقت کا حامل نہ ہونا اس بات کا ثبوت نہیں بنتا کہ وہ نظام ہی نادرست ہے بلکہ اس کا حال معاشرے میں جاری ورائج دیگر تمدنی اصولوں اور اجتماعی نظاموں جیسا ہوتا ہے کہ جو مختلف ومتعدد مراحل اور نشیب وفراز سے گزر کر بلکہ گوناگوں عوامل سے تصادم وٹکراؤ کے بعد معاشرے میں اپنی جگہ بناتا ہے، اسلام بھی طبیعی ومعاشرتی نظام کے حوالہ سے دیگر نظاموں کی طرح اس

قسم کے حالات کا شکار ہوا کیونکہ نظاموں اور معاشرتی تمدنوں کے حوالہ سے وہ بھی اس قاعدۂ کلیہ میں شامل ہے اس سے مستثنیٰ نہیں، اور اس کا حال بھی تقدم وتاخر اور عوامل وحالات اور اسباب کے ذریعے پیشرفت کرنے کے حوالہ سے دیگر نظاموں سے یکساں ہے اور موجودہ دور میں اس کی حالت (جبکہ اس کی حقانیت پر ایمان لانے والے چار سو ملین افراد دنیا کے گوشہ گوشہ میں آباد ہیں اور اسلام ان کے دلوں میں گھر کر چکا ہے...... یہ تعداد المیزان کے زمانہ تالیف کی ہے جبکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہے...... اس حالت سے زیادہ کمزور نہیں جو حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے عہد مبارک میں تھی، ان ہستیوں کے عہد ہائے مبارکہ میں دعوت دین کا کام صرف ایک ہی شخص کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا اور وہ بھی ایسے ماحول میں کہ پوری دنیا فسق وفساد میں گھری ہوئی تھی، پھر رفتہ رفتہ اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوگئیں، یہاں تک کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں بسنے والوں کے باہمی رابطوں اور میل جول کے نتیجہ میں اس کی پیشرفت کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جب دعوت حق کے مشن کا آغاز فرمایا تو اس وقت آپؐ کے ساتھ ایک مرد اور ایک خاتون کے علاوہ کوئی مددگار و حامی نہ تھا پھر یکے بعد دیگرے لوگ ان کے ساتھ ملحق ہوتے رہے جبکہ وہ ایام نہایت سختی اور تنگی وشدت کے تھے، ان کی استقامت اور صدق دلی کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مدد ونصرت سے نوازا اور وہ نیک وصالح اور متقی افراد پر مشتمل ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہوگئے اور جب تک آنحضرتؐ ظاہری زندگی کے ساتھ ان میں موجود تھے وہ معاشرہ نیکی وسعادت کی راہ پر گامزن ہوتا رہا مگر جب آنحضرت کا وصال ہوا اور آپؐ رحلت فرما گئے تو فتنوں کا ایک طوفان امڈ آیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ امت اسلامیہ کے لئے وبال بن گیا، مگر حق کی آواز کب تک دبی رہتی اور اسلام اپنی قلیل سی عمر اور نہایت سخت حالات سے گزرنے کے بعد اس طرح دنیائے بشریت میں پھیلتا گیا کہ نصف صدی سے کم عرصہ میں دنیا کے مشرق ومغرب تک اس کی آواز گونجنے لگی اور تاریخ میں ایک بنیادی تبدیلی اور ٹھوس انقلاب آگیا کہ جس کے آثار آج تک دیکھے جارہے ہیں اور یہ سلسلہ مزید وسعت پا رہا ہے اور اسے دوام حاصل ہو رہا ہے اور یوں ہی بڑھتا رہے گا۔

علم الاجتماع اور علم النفس کے ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دنیا میں اس وقت جو عظیم تبدیلی رونما ہو چکی ہے اس کا [illegible] حقیقت [illegible] ت کے افق پر خورشید اسلام کا طلوع ہونا ہے چنانچہ اس

سلسلہ میں اکثر یورپی محققین اور دانشوروں نے بھرپور بحث کرتے ہوئے واضح طور پر اظہار واعتراف کیا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن مغربی تہذیب وتمدن پر غالب آ گیا اور اس کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں، البتہ بعض یورپی دانشوروں نے تعصب یا سیاسی عوامل اور اسباب ووجوہات کی بناء پر اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے گریز کی راہ اپنائی ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی منصف مزاج محقق ودانشور اس سلسلہ میں بھرپور نظر کرنے کے باوجود عصر حاضر کے تہذیبی ارتقاء کا

اصل سبب دین مسیحیت کو قرار دے اور حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو اس کا رہبر وعلمبردار سمجھے؟ جبکہ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بیانات وارشادات میں واضح وصریح الفاظ میں فرمایا ہے کہ بشری زندگی کے مادی امور اور جسمانی مسائل سے انہیں ہرگز سروکار نہیں اور نہ ہی وہ معاشرہ کے حکومتی وسیاسی کاموں میں کسی طرح کی دخل اندازی کرتے ہیں، یہ تو اسلام ہے جو معاشرہ کی تشکیل اور باہمی میل جول کی دعوت دیتا ہے اور انسانی معاشرہ کے تمام امور میں بھرپور طور پر دخیل ہوتے ہوئے تمام افراد معاشرہ کے ساتھ یکساں صورت میں ...... یعنی کسی بھی استثناء کے بغیر...... مربوط ہوتا ہے، اس صورت میں علم الاجتماع وعلم النفس کے یورپی ماہرین کی طرف سے اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی کو نظر انداز کرنے میں کیا اس کے علاوہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ شمع اسلام کو بجھانے کے در پے ہیں (ویأبی اللہ ان یتم نورہ) جبکہ اللہ کو اپنے نور کے قائم رکھنے کے سوا کوئی بات گوارا نہیں، کیا وہ اپنی روش میں اسلام دشمنی کے سوا کوئی ہدف رکھتے ہیں جس کی بناء پر وہ دین حق کی محبت دلوں سے محو کرنے کے لئے کوشاں ہیں کہ اس کے نتیجہ میں قومیت وقوم پرستی کے مذموم عنوان سے اسلام کو آنے والی نسلوں میں مشکوک کر دیں؟

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام نے اپنے معاشرتی نظام میں لوگوں کی ہدایت ورہنمائی اور انہیں سعادت وخوش بختی کی راہ پر لانے کی بھرپور صلاحیت کا واضح وٹھوس ثبوت پیش کر دیا ہے، تو اس کے باوجود یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسے ایک ایسے مفروضہ کا نام دیا جائے جو انسانی زندگی میں عملی صورت اختیار نہ کر سکتا ہو، اور اس کے بارے میں یہ امید بھی نہ کی جاسکتی ہو کہ وہ دنیا میں کسی دن حکومت وحاکمیت کا حامل بن جائے (جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مقصد انسان کی حقیقی سعادت کے سوا کچھ نہیں)۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت: ۲۱۳ ''کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً'' کی تفسیر میں تفصیلی طور پر بیان ہو چکا ہے کہ موجودات عالم ہستی کے حالات پر نظر کرنے سے یہ حقیقت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ نوع انسانی بہت جلد اپنے اصل ہدف ومقصود کو پالے گی یعنی اسلام کا ظہور اور حقیقی غلبہ یقینی ہو جائے گا اور پورے انسانی معاشرے پر اسلام ہی کی مکمل حکمرانی ہوگی، چنانچہ اسی حوالہ سے خداوند عالم نے قرآن مجید میں واضح الفاظ میں وعدہ فرمایا ہے (ملاحظہ ہو):

سورۂ مائدہ آیت: ۵۴

O ''فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ''

(عنقریب اللہ ان لوگوں کو لے آئے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہو اور وہ اسے دوست رکھتے ہوں گے، وہ مومنین کے ساتھ نرم خو اور کافروں پر سخت دل ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوں گے اور اللہ کی بابت کسی سرزنش کرنے والے کی سرزنش سے خوفزدہ نہ ہوں گے۔)

سورۂ نور، آیت:۵۵

○ ''وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَـيْـــًٔا''

(اللہ نے تم میں سے ایمان والوں اور اعمال صالح بجالانے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں خلافت عطا کرے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے والے لوگوں کو خلافت سے نوازا، اور ان کے لئے اس دین کو پائدار و نافذ کر دے گا جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور انہیں ان کے خوف کے بعد امن کی نعمت عطا کرے گا وہ میری ہی عبادت بجالائیں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک قرار نہ دیں گے)۔

سورۂ انبیاء آیت:۱۰۵

○ ''اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ''

(بے شک زمین کے وارث میرے نیک و صالح بندے ہی ہوں گے)

ایک اہم نکتہ

زیر نظر موضوع کے حوالہ سے ایک نہایت اہم نکتہ قابل توجہ ہے کہ جسے ان حضرات نے درخور اعتناء قرار نہیں دیا بلکہ اس کی بابت غفلت برتی، اور وہ یہ کہ اسلامی معاشرہ کا شعار اور شناختی اصول صرف اور صرف فکر و عمل میں حق کی پیروی کرنا ہے، جبکہ موجودہ سماجی معاشرہ (سول سوسائٹی) کا شعار اور شناختی اصول اکثریت کی آراء و خواہشیں ہے، ظاہر ہے کہ ان دونوں اصولوں کے حوالہ سے معاشرتی اہداف و اغراض بھی مختلف ہو جاتی ہیں،

اب جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس کی تشکیل کی غرض و غایت حقیقی عقلی سعادت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی وجودی قوتوں کے تقاضوں کی تکمیل میں حد اعتدال میں رہے یعنی اپنی جسمانی خواہشات کو پورا کرنے میں اس حد تک عملی اقدام کرے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی نہ ہونے پائے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جسمانی تقاضے اسے خدا کی بندگی سے باز نہ کر دیں بلکہ اس کے برعکس صورت حال ہو اور وہ یہ کہ جسمانی تقاضوں و خواہشوں کی تکمیل اللہ کی معرفت کے ساتھ اس کی بندگی کے حق کی ادائیگی کا سبب و وسیلہ بن جائے کہ اسی میں انسان کی سعادت کا راز پوشیدہ ہے اور اس کی تمام قوتوں کی سعادت اس پر موقوف ہے اور حقیقی راحت و سکون بھی یہی ہے (اگرچہ موجودہ زمانہ میں ہم اس حقیقی راحت و سکون کا صحیح معنی میں ادراک نہیں کر پاتے کیونکہ ہم میں اسلامی تربیت کا فقدان ہے) اسی لئے جو حق کی پیروی کے

حقیقی اصول پر قائم ہے یعنی عقل کہ جو فطرت سلیمہ کی ترجمان ہے اس کے تقاضوں کی تکمیل ہی اسلامی قوانین واحکام کی اصل و اساس ہے اور وہ حق کی پیروی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا اسلام نے عقل سلیم سے متصادم ہر کام کی سختی سے ممانعت کی ہے اور ہر اس کام کو ممنوع قرار دیا ہے جس سے عقل سلیم کی کارگزاری متاثر ہوتی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل سلیم حق کی پیروی کے علاوہ کسی کام کا نہ تو حکم دیتی ہے اور نہ ہی اس کی حمایت کرتی ہے، اسلام نے اپنے قوانین واحکام کے نفاذ وعملداری کی ذمہ داری معاشرہ پر چھوڑ دی ہے اور اسے ہی اس حوالہ سے ضامن قرار دیا ہے کہ وہ تمام اعمال واخلاق اور حقیقی معارف کے عملی تقاضوں کو پورا کرے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام حکومت وحاکیت اپنے مخصوص سیاسی اصولوں اور قواعد وضوابط کے اجراء کے ساتھ عقل سلیم کی اصل واساس یعنی حق کی پیروی کو یقینی بنانے میں اپنا کردار کرتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ عامتہ الناس کے ذوقِ طبع سے ہرگز ہم آہنگ نہیں اور اسے ان کا نفسانی خواہشات کے دلدل میں گھرا ہونا اس سے روکتا ہے کہ وہ ان عقلی اصولوں کی عملی پاسداری کریں، کیونکہ اس وقت عالمی معاشرتی صورتحال کا مشاہدہ ایک نہایت خوفناک منظر پیش کر رہا ہے کہ اس میں افراد بشر، مادی خواہشوں کے اسیر ہو چکے ہیں اور ثروتمندوں و نادار دونوں طبقوں کے افراد نے ہوس پرستی کا ایک بازار گرم کر رکھا ہے جس میں ان کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی ہے اور انہیں مخصوص لذتوں سے لطف اندوز ہونے کے سوا کچھ بھی بھائی نہیں دیتا، اس نہایت سنگین صورت حال سے نکلنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ وطریقہ ہے کہ تمام تر قوتوں ووسائل کو بروئے کار لایا جائے اور اسلامی مشن کی تبلیغ وسیع پیمانہ پر کی جائے اور صحیح تربیت کا دائرہ اس قدر پھیلایا جائے کہ اس سے مطلوبہ نتائج کا حصول یقینی ہو جائے۔ اور اسے اسی طرح اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے جس طرح زندگی کے دیگر امور میں اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لائی جاتی ہیں اور مطلوبہ مقاصد کے حصول تک ہر ممکن راستہ اختیار کیا جاتا ہے،

یہ تو ہے اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے اہداف اور اغراض ومقاصد کے حوالہ سے اصل بنیادوں کا بیان، اور جہاں تک موجودہ سماجی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس کی تشکیل میں صرف ایک ہی مقصد ملحوظ ہے اور وہ مادی لذتوں سے بہرہ ور ہونا اور مادی امور سے لطف اندوز ہونا، اس مقصد کا حصول زندگی کو مادی تقاضوں سے ہم رنگ وہم آہنگ کرنے کے بغیر ممکن نہیں یعنی اگر اس مقصد تک پہنچنا چاہیں تو زندگی کو سراپا مادی احساسات سے لیس کریں اور جو کچھ طبیعت چاہے اسی کو اپنائیں خواہ وہ عقلی طور پر حق کے مطابق وموافق ہو یا موافق ومطابق نہ ہو اور صرف انہی امور میں عقل کی پیروی کریں جن میں ان کی مادی اغراض و اہداف متاثر نہ ہوتے ہوں، اسی وجہ سے سماجی معاشرہ کے قوانین کی تدوین و اجراء میں اکثریت کی خواہشات اور طبعی رجحانات ہی ملحوظ قرار پاتے ہیں، اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی قوانین کے اجراء کی ضمانت صرف انہی قانونی مشقوں میں پائی جاتی ہے جن کا تعلق افراد کے اعمال سے ہوتا ہے اس کے علاوہ دیگر امور کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہوتی یعنی اخلاق وعقائد اور اس طرح کے حقیقی امور کو کسی طرح قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ کام لوگوں کی خود تشخیصی بنیاد پر چھوڑ دیا

جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں ان کا اپنا فیصلہ ہی اصل ہے، اور اس میں انہیں کسی قانون یا ضابطہ سے کوئی ربط نہیں، (گویا پرسنل لاء اور پبلک لاء کی اصطلاحات کا سہارا لے کر اس سلسلہ میں معاشرتی ضوابط وضع کئے جاتے ہیں، م) لیکن اگر افراد کے خود تشخیصی حوالہ سے اخلاقی اواعتقادی اصولوں میں سے کوئی چیز سماجی قوانین سے متصادم ہوتو اسے برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس وقت اس کی ممانعت کا دستور آ جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں صرف وہی چیزیں رائج ہو جائیں جو لوگوں کی پست نفسانی خواہشات سے مطابقت رکھتی ہوں اور پورا معاشرہ انہی چیزوں کا رسیا ہو جائے تو اس میں وہی چیزیں محبوب و مستحسن قرار پائیں گی جنہیں دین برا اور قبیح قرار دیتا ہے اور پھر اخلاقی فضائل واعتقادی اصول، قانونی آزادی کی آڑ میں بازیچۂ افراد بن جائیں گے کہ پھر ہر کہ ومہ ان کا مذاق اڑاتا ہوا دکھائی دے گا۔

اس تمام صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا انداز فکر ہی بدل جائے گا اور طرز تفکر کی یہ تبدیلی انہیں عقل کی دنیا سے نکال کر احساسات وجذبات اور طبعی رجحانات کا رسیا بنا دے گی، اس طرح فضائل وکمالات کے معیار ہی بدل جائیں گے اور جس کام کو عقل فسق وفجور قرار دے گی اسے خواہشات وجذبات اور احساسات کی دنیا میں تقویٰ سمجھا جائے گا اس کی مثال یورپی معاشرہ کی موجودہ صورت حال ہے کہ اس میں نوجوانوں، مردوں، عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کے باہمی روابط و تعلقات کے معیار نہایت پست اور غیر عقلی ہیں مثلاً نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان آزادانہ روابط وتعلقات، مردوں کے مردوں کے ساتھ اور عورتوں کے عورتوں کے ساتھ جنسی روابط، شادی شدہ عورت کے ساتھ نامحرم مردوں کے تعلقات، غیر شادی شدہ لڑکیوں کے ساتھ جنسی تعلقات، عورتوں اور کتوں کے درمیان جنسی روابط، اولاد اور محرموں کے ساتھ جنسی تعلقات، اسی طرح رقص وسرور کی مشترکہ محفلوں اور ایسے مخلوط اجتماعات کہ جن کا تذکرہ دینی ادب کے حامل افراد کو زبان پر لاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے، ایسے امور کی بنیادیں اور معیاروں کا عقلی اصولوں سے کسی طرح ربط نہیں بنتا بلکہ ان میں مادی ونفسانی خواہشات کے علاوہ کچھ بھی ملحوظ نہیں ہوتا، اور پھر اس کے نتیجہ میں دینی معمولات کو حیرت وتعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بلکہ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس سماجی معاشرتی رسم ورواج اور معمولات کو احترام اور قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، یہ سب کچھ درحقیقت طرز تفکر اور فہم وادراک کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے کہ دینی طرز تفکر کچھ اور ہے اور مادی انداز فہم وادراک کچھ اور!

حقیقت یہ ہے کہ سماجی معاشرتی اصولوں میں تعقل نام کی چیز پائی ہی نہیں جاتی...... جیسا کہ سابقہ بیانات سے واضح ہو چکا ہے...... اور اگر عقلیات میں سے کچھ پایا بھی جاتا ہے تو وہ صرف اسی حد ومقدار تک کہ نفسانی ومادی خواہشوں سے لطف اندوز ہو سکیں اور مخصوص لذائذ سے بہرہ ور ہو سکیں، یہی واحد وہ شے ہے جس کا مقابلہ کسی دوسری چیز سے نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ومانع ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ اس جیسی دوسری چیز مل جائے، یعنی کوئی دوسری لذت حاصل

ہو، یہاں تک کہ موجودہ مادی معاشروں کے ہاں رائج و نافذ قوانین کی رو سے ہر وہ کام جسے انسان پسند کرے اسے قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ آزادی کا قانون ہر کام پر حاوی ہے لہذا خودکشی جیسے اعمال کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہو گا، البتہ اس میں صرف ایک استثنائی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ کسی کی انفرادی خواہش، معاشرتی خواہش سے متصادم ہو، تو اس صورت میں معاشرتی خواہش ملحوظ ہو گی اور انفرادی خواہش کو قانونی حیثیت یا تحفظ حاصل نہ ہو گا۔

مذکورہ بالا مطالب پر غور کریں اور دونوں معاشروں یعنی دینی معاشرہ اور مادی معاشرہ کے معیار و طرز تفکر کے مختلف ہونے کے بارے میں سوچیں تو آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ مغربی معاشرہ کے قوانین بنی نوع بشر کے ذوق طبع سے ہم رنگ و ہم آہنگ کیوں ہیں اور دینی معاشرتی قوانین کے مقابلے میں ان کی محبوبیت و پسندیدگی کا راز کیا ہے؟ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ استثنائی صورت مغربی معاشرتی قوانین کو حاصل نہیں بلکہ دنیا بھر میں قدیم وجدید تمام غیر دینی اور خالص مادی معاشروں کے قوانین کا یہی حال ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ تاریخ میں ان دیہاتی معاشروں کا جو حال بیان کیا گیا ہے جو تمدن کی دنیا سے بہت پہلے تھے اس میں بھی صورتحال اسی طرح کی ہے کہ عامۃ الناس دینی اصولوں پر کہ جن میں سراسر حق کی طرف دعوت پائی جاتی ہے اپنی مخصوص مادی لذتوں کو ترجیح دیتے تھے اور بت پرستی کی ایسی لت انہیں لگی ہوئی تھی کہ اس کے ساتھ مادی لذتوں کے علاوہ کچھ سننے اور کرنے کو تیار نہ تھے۔

اگر آپ موجودہ ترقی یافتہ تمدن کے بارے میں بخوبی غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی اصل بنیاد بت پرستی کے حامل تمدن کی وہ قدیم روش ہے جو انفرادیت سے اجتماعیت میں تبدیل ہو چکی ہے، گویا قدیم الایام میں اسے شخصی و فردی حیثیت حاصل تھی جبکہ موجودہ دور میں اسے معاشرتی و اجتماعی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، یا یوں کہیں کہ سادگی کے مرحلہ سے تکنیکی و فنی پیچ و خم کے حامل مرحلہ تک پہنچ گئی ہے،

اسلامی معاشرتی اصولوں کے حوالہ سے ہم نے جو بیان کیا ہے کہ ان کی اصل و اساس حق کی پیروی ہے نہ کہ ذوق طبع و خواہشات نفس سے ہم رنگی و ہم آہنگی، تو اس سلسلہ میں واضح قرآنی بیانات موجود ہیں مثلاً:

سورۂ توبہ، آیت: ۳۳

- ''هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ''

(وہ اللہ کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا)

سورۂ مومن، آیت: ۲۰

- ''وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ''

(اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے)

اہل ایمان کی توصیف میں یوں ارشاد ہوا:

سورۂ عصر، آیت: ۳

- ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ''

(اور وہ ایک دوسرے کو حق کی وصیت وتاکید کرتے ہیں)

سورۂ زخرف، آیت: ۷۸

- ''لَقَدْ جِئْنَاكُمْ بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ''

(بے شک ہم تمہیں حق کے ساتھ لائے ہیں لیکن تمہاری اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے)

اس آیت میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ حق، اکثر لوگوں کی طبیعتوں اور مزاجوں وخواہشوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔

اس کے بعد دوسرے مقام پر اکثریت کی پیروی کی رد میں اور یہ کہ وہ موجب فساد ہے یوں ارشاد ہوا:

سورۂ مومنون، آیت: ۷۱

- ''بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ۝ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ۚ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ''

(بلکہ ان کے پاس حق آ گیا اور ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے، اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین تباہ وبرباد ہو جائیں گے اور جو ان میں رہتا ہے وہ بھی تباہ ہو جائے گا، بلکہ ہم نے ان کو ان کا سرمایہ ہدایت دے دیا ہے مگر وہ اپنے سرمایہ ہدایت سے روگردانی کرتے ہیں)

اس آیت میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا اس کی تصدیق وتائید روز بروز وقوع پذیر ہونے والے حالات وواقعات نے کردی ہے اور حوادث وفسادات کی ہلاکت خیز طوفانی موجوں نے قرآنی بیانات کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔

سورۂ یونس، آیت: ۳۲

- ''فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۖ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ''

(تو حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کیا ہے؟ تم کہاں بھٹکے جا رہے ہو؟)

بہر حال اس مضمون کی حامل آیات کثرت کے ساتھ موجود ہیں، اگر اس حوالہ سے مزید جاننا چاہیں تو سورۂ یونس کا مطالعہ کریں کہ اس میں بیس سے زائد مرتبہ حق کا تذکرہ ہوا ہے۔

ایک سوال اور اس کا تفصیلی جواب

یہاں اکثریت کے حوالہ سے ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اکثریت کو اس قدر مورد تنقید کیوں بنایا گیا ہے جبکہ اکثریت کا اتباع ایک معاشرتی حقیقت ہے جسے رد نہیں کیا جاسکتا اور عالم طبیعت میں اس کی اہمیت کسی بھی شک وگمان سے بالاتر ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اکثریت کی معاشرتی حیثیت کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور عالم طبیعت میں اتباع اکثر کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے اتباع حق کے بطلان کا موجب مانا جائے یا کہ اسے اتباع حق کے لازمی وضروری ہونے سے متصادم قرار دیا جائے کیونکہ طبیعت خود ہی "حق" کے مصادیق میں سے ایک ہے، تو وہ کس طرح خود اپنے ہی بطلان کا سبب بن سکتی ہے۔

مزید وضاحت: اس کی وضاحت کے لئے چند امور کا بیان ضروری ہے۔

(۱) انسان کے علمی وعملی عقائد کے بنیادی اصول وہ امور خارجیہ اور وجودی حقائق ہیں جو اپنی وجودی حیثیت اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی اقسام میں نظام علت ومعلول کے محتاج ہیں اور وہ ایسا مضبوط نظام ہے جسے دوام وثبات حاصل ہے اور اس میں کسی استثنائی صورت کی بھی گنجائش نہیں، اس کی تصدیق میں اہل علم ونظر نے اجتماعی طور پر ایک ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور قرآن مجید نے بھی اسی کی صحت پر گواہی دی ہے (اعجاز قرآن کی بحث میں اس حوالہ سے تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے، ملاحظہ ہو جلد اول بحث اعجاز قرآن) لہٰذا عالم الخارج میں پایا جانے والا سلسلہ دوام وثبات کی صفتوں سے جدا نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ وہ حوادث جو اکثر وقوع پذیر ہوتے ہیں اگر چہ وہ اپنے حوالہ ونسبت سے قیاسی ہیں یعنی اصول وضوابط پر مبنی ہیں لیکن ان کا "اکثر" ہونا دائمی وہمیشگی ہے مثلاً آگ، وہ تمام موارد میں حرارت دیتی ہے اور اس کے گرمی وحرارت دینے کو "اکثر" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ وہ عموماً حرارت دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس کا یہ اثر دائمی وہمیشگی ہے، یہی بات ہر اس چیز کے بارے میں کی جاسکتی ہے جو اسی طرح کا اثر رکھتی ہو، اس کے "حق" کہتے ہیں۔

(۲) انسان فطرتاً ہر اس چیز کا اتباع کرتا ہے جسے کسی بھی حوالہ سے ایک حقیقی اور عالم الخارج میں وجود کا حامل پائے، اس طرح وہ اتباع حق کرتا ہے اور یہ اتباع حق اس کی فطرت میں داخل ہے، یہاں تک کہ جو شخص یقینی وپختہ علم کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا وہ بھی جب کسی ایسے شخص کی بات سنتا ہے جس کے بیان کے بارے میں اپنے تئیں کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار

نہیں ہوتا تو اسے فوراً قبول کر لیتا ہے، تو گویا عملی طور پر وہ بھی قطعی علم کو تسلیم کرتا ہے۔

(۳) ''حق'' جیسا کہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں وہ عالم الخارج میں پائی جانے والی ایسی وجودی حقیقت ہے جس کے سامنے انسان اپنے اعتقادات واعمال میں سر تسلیم خم کر دیتا ہے، اور جہاں تک انسان کی فکر ونظر اور فہم وادراک کا تعلق ہے تو وہ ایک وسیلہ وذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعے حق تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے، گویا وہ ایک آئینہ کی مانند ہے جو اشیاء کو دکھاتا ہے، یعنی جو نسبت آئینہ اور آئینہ کے ذریعے دیکھی جانے والی چیز کے درمیان پائی جاتی ہے وہی نسبت فکر ونظر اور حق کے درمیان پائی جاتی ہے۔

جب آپ ان امور سے آگاہ ہو چکے تو آپ پر واضح ہو گیا کہ ''حق ہونا'' جو کہ ہمیشہ وقوع پذیر ہونے یا بیشتر واکثر وقوع پذیر ہونے کا نام ہے اور کسی چیز میں اس صفت کا پایا جانا اس کے دوام وثبات کا پتہ دیتا ہے تو وہ عالم الخارج میں پائے جانے والے امور کی دائمی الوقوع یا اکثر الوقوع ہونے کی صفت ہے، اس میں اس کے بارے میں علم وادراک کا ہونا ہرگز دخیل نہیں یعنی ایسا نہیں کہ اگر اسے جانتے یا پہچانتے ہوں تب وہ حق ہے ورنہ نہیں، ایسا ہرگز نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ایک معلوم امر کی صفت ہے نہ کہ علم کی صفت! یعنی کسی چیز کا حق ہونا اس چیز کی صفت ہے جس سے ہم آگاہ ہوں نہ کہ اس ہمارے علم کی صفت! بنابرایں دائمی الوقوع ہونا اور اکثر الوقوع ہونا بھی ایک حوالہ سے حق کہلاتا ہے لیکن اس سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ اقلیت کے مقابلے میں اکثریت کی آراء وافکار اور ان کے اعتقادات کو دائمی الوقوع حق قرار دیا جائے اور کہا جائے کہ جس پر اکثر افراد کا اتفاق ہو وہ حق ہے یا جو عقیدہ اکثریت کا ہے وہ حق ہے، ایسا ہرگز درست نہیں، بلکہ حق کے حق ہونے کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ چیز حقیقت کے عین مطابق ہو ورنہ اسے ''حق'' قرار نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جو چیز حقیقت سے مطابقت کی حامل ہو اسے حق سے موسوم کرنا درست ہوگا خواہ اکثریت اس کے خلاف وبرعکس کیوں نہ ہو، اس معیار کی روشنی میں جو چیز حقیقت سے مطابقت نہ رکھتی ہو نہ تو وہ ''حق'' قرار پائے گی اور نہ ہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا صحیح ہوگا، اور اگر ''حق سمجھ کر اس کا اتباع کیا گیا ہو اور پھر اس کا حق نہ ہونا معلوم وثابت ہو جائے تو اس سے دور ہو جانا ضروری ہوگا، مثلاً اگر کوئی شخص کسی عقیدہ ونظریہ کو حق سمجھ کر اس کا اتباع کرتا رہا ہو اور پھر اسے معلوم ہو جائے کہ وہ حق نہیں تو فوراً اس سے اجتناب کرے اور جو حق ہو اس کا اتباع کرے، اس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ اگر آپ کو کسی چیز کے بارے میں یقین حاصل ہو جائے (وہ چیز آپ کے نزدیک یقینی ہو جائے) پھر تمام لوگ اس کی بابت آپ سے اختلاف کریں تو آپ طبعاً ان کے ساتھ ہاں نہیں ملاتے اگر چہ ظاہری طور پر ان کا ساتھ دیتے ہیں کہ جو ان سے ڈر، شرم یا کسی دوسری وجہ سے ہوتا ہے نہ یہ کہ ان کا ساتھ دینا حق اور فی نفسہ واجب الاتباع ہے۔

اکثریت کی رائے ونظریہ کے واجب الاتباع حق نہ ہونے کے حوالہ سے بہترین بیان وہ ہے جس میں خداوند عالم نے ارشاد فرمایا:

سورۂ مومنون، آیت: ۷۰

○ ''بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ''

(بلکہ ان کے پاس حق آ گیا جبکہ ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرتی ہے)

اگر اکثریت کی رائے ''حق'' ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اکثریت اسے ناپسند کرتی اور اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے۔

مذکورہ بالا بیان سے اس نظریہ کا بطلان بھی ثابت ہو جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ معاشرتی نظام میں اکثریت کا اتباع طبعی بنیادوں پر ہے اور طبع معاشرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اکثریت کا اتباع کیا جائے اور اکثریت جس چیز کو درست قرار دے اسے معاشرتی تائید حاصل ہوتی ہے، یہ نظریہ اس لئے درست نہیں کہ جن طبعی بنیادوں و اصولوں اور روش کو اتباع اکثریت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے ان کا تعلق عالم الخارج میں وجود پذیر ہونے والے امور سے ہے کہ جن سے علم و آگاہی تعلق پکڑتی ہے جبکہ نظریہ و رائے کا تعلق عالم الخارج سے نہیں بلکہ عالم ذہن سے ہوتا ہے اور جہاں تک انسان کا اس سنت و روش سے اپنے ارادہ و اعمال میں استفادہ کرنے کا تعلق ہے اور اسے اپنے اعمال و افعال میں بنیادی حیثیت دینے کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے صرف انہی امور کو اساس و بنیاد بنایا جاتا ہے جو عالم الخارج میں اکثر وقوع پذیر ہوتے ہوں نہ کہ وہ امور کہ جن کے بارے میں اکثریت عقیدہ رکھتی ہو، یعنی وہ اس لئے انہیں بنیادی حیثیت نہیں دیتا کہ افرادی اکثریت اسے حق اور صحیح سمجھتی ہے بلکہ اس لئے انہیں بنیادی حیثیت دیتا ہے کہ وہ عالم الخارج میں اکثر وجود پذیر ہوتے ہیں، گویا وہ اپنے اعمال و افعال کی انجام دہی میں اس طرح کوشاں ہوتا ہے کہ وہ بیشتر بہتر و صحیح اور درست قرار پائیں نہ یہ کہ اکثر لوگ انہیں بہتر و صحیح سمجھیں، اس مطلب کی تائید قرآنی بیانات میں بھی ملتی ہے کہ قرآنی احکام میں اکثر الوقوع امور کو بنیادی حیثیت و اہمیت کا حامل قرار دیا گیا ہے، مثلاً:

سورۂ مائدہ، آیت: ۶

○ ''مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ''

(خدا یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی طرح کی دشواری ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے تم پاک و پاکیزہ رہو اور اس کے نتیجہ میں تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کرے)

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۸۳

○ ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ''

(تم پر روزے واجب کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والے لوگوں پر واجب کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر متعدد آیات موجود ہیں جن میں خدائی دستورات اکثر وقوع پذیر ہونے اور وجود میں آنے کو بنیادی حیثیت قرار دیئے جانے کا حوالہ مذکور ہے۔

ایک اظہاریہ اور اس کا جواب

اکثریت کی آراء کی اعتباری حیثیت کے حوالہ سے ایک اظہاریہ یوں ہے کہ عصر حاضر کا مروجہ تمدن ہی ہے جس نے ممالک و معاشروں کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہوئے انہیں سعادت سے ہمکنار کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ افراد کے تذکیہ نفس کا بھی اہتمام کیا اور انہیں ان رزائل سے پاک کر دیا ہے جنہیں معاشرہ ناپسندیدہ سمجھتا ہے،
یہ اظہاریہ غلط و نادرست اور خلط بحث کا حامل ہے، اس میں جس ''سعادت'' کو بیان کیا گیا ہے وہ حقیقی معنی میں سعادت نہیں، کیونکہ انہوں نے معاشرتی سعادت سے مادی وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے دوسرے معاشروں پر تفوق و برتری پانا اور اپنے معاشرہ کو مادی حوالہ سے طاقتور اور بلند پایہ قرار دینا مراد لیا ہے، اور قارئین کرام اس حقیقت سے متعدد بار آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلام اس طرح کی ترقی و پیش رفت کو ''سعادت'' قرار نہیں دیتا اور عقلی دلائل سے بھی اس اسلامی نقطہ نگاہ کی تصدیق و تائید ہوئی ہے کیونکہ حقیقی معنی میں انسانی سعادت روح و بدن دونوں کی سعادت کے مجموعہ مرکب کا نام ہے کہ جس میں انسانی مادی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی نعمتوں و لذتوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہوئے اخلاقی فضیلتوں اور خدائی معارف و حقائق کے زیوروں سے آراستہ ہونے کی عزت پائی جاتی ہے، اور اسی میں دنیاوی زندگی اور اخروی حیات دونوں کی سعادت کی ضمانت پائی جاتی ہے اور جہاں تک روحانی سعادت کو پس پشت ڈال کر صرف مادی لذتوں میں اپنے آپ کو آلودہ کرنے کا تعلق ہے تو اسلام اسے نہ صرف یہ کہ سعادت نہیں سمجھتا بلکہ شقاوت و بدبختی سے موسوم کرتا ہے۔
اب رہی یہ بات کہ عصر جدید کے مروجہ مغربی تمدن کے رسیا دانشوروں کا اپنے معاشروں میں صدق و صفا، امانتداری و خوش اخلاقی اور دیگر اعلیٰ صفات پر اظہار فخر و مباہات کرنا تو اس حوالہ سے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوئے ہیں اور ان کے اس طرح غلط فہمی کا شکار ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے اکثر مشرقی اہل بحث و نظر اور دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ اجتماعی و معاشرتی طرز تفکر سے آگاہ ہی نہیں اور نہ ہی اس کی توان رکھتے ہیں، ان کے فکری زاویہ کی حدود ان کی ذات سے باہر نہیں؛ وہ جو کچھ سوچتے ہیں خود اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور اس فردی و شخصی طرز تفکر کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو ایک مستقل انسان سمجھتے ہیں کہ جس کا دیگر موجودات سے کوئی تعلق و وابستگی نہیں اور اپنے تئیں یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ ہر اس ربط و تعلق اور دوسروں سے وابستگی سے مبرا ہیں جو ان کے فردی تشخص اور شخصی استقلال کو ٹھیس پہنچائے (جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے) اسی غلط طرز تفکر کی بناء پر وہ اپنی زندگی میں صرف اپنے ہی مفاد کی فکر کرتے رہتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کے بارے میں سوچتے ہیں، گویا اپنے سوا کسی کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے، اسے ہی شخصی سوچ کہتے ہیں، اسی کے

نتیجہ میں وہ دوسروں سے موازنہ کے عمل میں غلطی سے دوچار ہو جاتے ہیں اور مغربی معاشروں کے باسیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمتر سمجھتے ہوئے انہیں ترقی یافتہ وسعادت مند قرار دے دیتے ہیں جو کہ سراسر نادرست ہے لیکن شخصی سوچ کے اسیر افراد سے اس کے علاوہ کوئی توقع بھی نہیں ہو سکتی اور ان کا ایسا سوچنا انہی کے طرز تفکر کے دائرہ سے مختص ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس جو شخص اجتماعی ومعاشرتی سوچ رکھتا ہو اور اس کے طرز تفکر کا دائرہ وسیع ہو اس کی نظروں میں اپنی ذات ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا لازمی حصہ اور جزو لاینفک سمجھتا ہے، اپنے فوائد ومفادات کو معاشرہ کے فوائد ومفادات کا حصہ قرار دیتا ہے اور معاشرہ کی خیر وسعادت کو اپنی خیر وسعادت اور معاشرہ کے نقصان وتکلیف کو اپنا نقصان وتکلیف سمجھتا ہے، یعنی اپنے آپ کو معاشرہ سے جدا نہیں سمجھتا اور معاشرہ کی ہر صورت حال کو اپنی شخصی صورت حال قرار دیتا ہے، اس اجتماعی ومعاشرتی طرز تفکر کا حامل انسان، شخصی سوچ کے حامل انسان سے مختلف ہوتا ہے، وہ دوسروں سے تعلق کے حوالہ سے ایک وسیع سوچ کے ساتھ دوسرے معاشروں کے افراد ہی کے بارے میں اپنی فکری وعملی توانائیاں بروئے کار لاتا ہے، اور اس حوالہ سے اپنے معاشرہ کے افراد کو درخور اعتناء قرار نہیں دیتا اور نہ ہی ان کے لئے عملی تجاویز کے بارے میں کسی فیصلہ پر غور کرتا ہے۔

مذکورہ بالا مطلب کی وضاحت ایک مثال کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ انسان وجودی طور پر مختلف ومتعدد اعضاء وجوارح اور قوتوں سے لیس ہے اور گوناگوں صلاحیتوں کا مجموعہ مرکب ہے کہ ان قوتوں کا یکجا ہونا ایک ایسی وحدت کو وجود میں لاتا ہے جسے ہم ''انسانیت'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور یہ حقیقی وحدت ان تمام قوتوں کو ایک مجموعی استقلال کے قالب میں ڈھال کر اس طرح فعال بنا دیتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک قوت کو اپنی انفرادی کارگزاری سے عملی طور پر دستبردار ہو کر اجتماعی کارگزاری کی راہ پر آنا پڑتا ہے اور پھر ان ہی سے ہر ایک اپنی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کو اختیار کرتی ہے مثلاً آنکھ، کان، ہاتھ اور پیر اپنی عملی کارگزاری میں اجتماعی حوالہ سے سامنے آتے ہیں، آنکھ دیکھتی ہیں، کان سنتے ہیں، ہاتھ کام کرتے ہیں، پاؤں حرکت کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ''انسانیت'' اور ''انسان'' کے عنوان اور قالب میں انجام پذیر ہوتا ہے اور یہ تمام قوتیں انسانیت کی بنیاد پر عملداری سے لطف اندوز ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک قوت کا وجودی علمداری میں یہی ہدف مقصود ہوتا ہے کہ ان کی پہچان ''انسان'' کے حوالہ سے ہو اور ان کی کارگزاری کو ''انسان'' کی کارگزاری کہا جائے مثلاً اگر ہاتھ کسی پر احسان کرتا ہے اور اسے صدقہ دیتا ہے تو اس کی بنیاد انسان کی چاہت ہوتی ہے کہ احسان ہو اور صدقہ دیا جائے اسی طرح اگر کسی کو اذیت وآزار دینا ہو تو ہاتھوں کے ذریعے ہی اس ہدف کو حاصل کیا جاتا ہے لیکن ان قوتوں کی باہمی عملداری اور ایک دوسرے کے ساتھ عملی ارتباط میں بہت کم ایسے مواقع سامنے آتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے تصادم میں ہوں اور ایک دوسرے کو اذیت وضرر پہنچائیں۔

تو یہ صورتحال انسانی وجودی قوتوں واجزاء کی ہے کہ سب کے سب ایک ہی اجتماعی حیثیت کے حامل ہیں اور اجتماعی وحدت کے ساتھ اپنی عملداری کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں، یہی حال معاشرہ کے افراد کا ہے کہ اگر وہ سب اجتماعی سوچ کے ساتھ کام کریں اور اجتماعی طور پر غور وفکر کریں تو ان کی صلاح وبہتری اور تقویٰ یا دوسری جانب فساد وگناہ، اور اسی طرح نیکی واحسان کرنا یا برائی وغلطی کرنا سب کے سب ان کے معاشرہ سے منسوب ہوں گے اور پھر اس اجتماعی طرزِ تفکر اور طرزِ عمل کے نتیجہ میں پورا معاشرہ ایک ہی وحدت کا حامل ہوگا اور ایک ہی اکائی میں پرو دیا جائے گا۔

قرآن مجید نے بھی مذہبی واعتقادی یا قومی وملی تعصبات کا شکار قوموں اور ملتوں کے بارے میں جو روش اختیار کی ہے وہ بھی اسی اجتماعی حوالہ کی بنیاد پر ہے مثلاً یہودیوں، عربوں اور متعدد سابقہ امتوں کے بارے میں قرآنی انداز کچھ اس طرح پر ہے کہ وہ ان کے موجودہ افراد کا ان کے پہلے افراد کے جرائم کی بنیاد پر مواخذہ کرتا ہے اور انہیں موردِ عتاب وسرزنش قرار دیتا ہے کہ ان کے سابقہ افراد نے اس طرح کے افعال قبیحہ کا ارتکاب کیا جبکہ ان جرائم کے مرتکب افراد کا تعلق قدیم زمانہ سے ہے اور ان سے تعلق رکھنے والے موجودہ افراد ان اعمال وافعال سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں تو اصل میں اس طرح کا طرزِ تفکر ان کی اجتماعیت ومعاشرتی حیثیت کے حوالہ سے ہے اور یہ اجتماعیت کے تناظر میں بالکل صحیح ودرست مؤقف ہے کیونکہ جو شخص بھی اجتماعی فکر ونظر رکھتا ہو وہ اسی مؤقف کو اختیار کرتا ہے اور قرآن مجید میں اس حوالہ سے کثرت کے ساتھ آیات مبارکہ پائی جاتی ہیں کہ ان سب کا ذکر یہاں ضروری نہیں، ہاں البتہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جو اقوام ان جرائم کی مرتکب ہوئیں اور اس حوالہ سے موردِ سرزنش قرار پائیں ان میں سے ان افراد کو مستثنیٰ کیا جائے جو نیک وصالح تھے تاکہ ان کا حق پامال نہ ہونے پائے کیونکہ وہ لوگ اگرچہ انہی فاسد افراد کے ساتھ معاشرے میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے لیکن ان کے دل غلط سوچ میں آلودہ نہیں ہوئے اور نہ ہی وہ اس مہلک بیماری میں مبتلا تھے جس کے سبب ان کا معاشرہ تباہ ہوا وراس معاشرہ کے افراد پر عتاب وعقاب نازل ہوا، اس کے باوجود قرآن مجید میں جب اس معاشرے کا تذکرہ ہوا تو اس کے صالح ونیک افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

مذکورہ بالا مطالب سے واضح ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ معاشروں کے بارے میں مؤقف اختیار کرنے میں افراد کی انفرادی حیثیتوں کو معیار قرار نہیں دینا چاہئے اور نہ ہی کسی معاشرہ کے افراد کا دوسرے معاشرہ کے افراد سے انفرادیت کی بنیاد پر موازنہ کرنا چاہیے یعنی افراد کا کسی معاشرہ میں زندگی بسر کرنا اور اندرونی اجتماعی طرزِ عمل میں مخصوص صفات کو اپنانا اس بات کا سبب نہیں بن سکتا کہ کلی طور پر اس معاشرہ کو دیگر معاشروں پر مقدم وافضل قرار دیا جائے مثلاً اگر کسی مغربی معاشرہ میں اس کے افراد کا باہمی طرزِ عمل ایسا ہو کہ اس کی تعریف کی جائے بلکہ وہ لائق تعریف ہو کیونکہ اس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولتے ہوں اور نہ ہی ایک دوسرے کو اذیت وآزار پہنچاتے ہوں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھے انسانی تعلقات

رکھتے ہوں اور اچھی انسانی اعلیٰ صفات کے حامل ہوں تو اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ وہ معاشرہ اس معاشرہ سے کلی طور پر اور تمام حوالوں سے افضل و بہتر قرار پائے کہ جس میں اس طرح کی صورتحال نہ پائی جاتی ہو یا اس کے برعکس صورت حال ہو، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ معاشرہ دوسرے معاشرے کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتا ہے اور معاشرتی و اجتماعی حوالہ سے اس کا برتاؤ دوسرے معاشروں سے کس طرح کا ہے؟ گویا افرادی انفرادیت یا اجتماعیت کے باہمی ربط و تعلق کی بجائے معاشرہ کی دوسرے معاشرہ سے تعلق داری کو معیار قرار دیا جانا چاہیے، اسی معیار پر کسی معاشرہ کے صالح یا فاسد ہونے کا تعین ہونا چاہیے اور اس کے سعادت مند یا شقی ہونے کے بارے میں رائے قائم کی جائے، ہمارے دانشوروں کو بھی اسی معیار پر اپنے اظہارات کرنے چاہئیں لیکن افسوس کہ بعض حضرات اس معیار کو پس پشت ڈال کر موقف اختیار کرتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اس معیار کے مطابق اپنے نظریات قائم کریں۔

میں اپنی زندگی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہمارے دانشور حضرات مغرب والوں کی اجتماعی و معاشرتی زندگی کی تاریخ کا مطالعہ کرتے اور جدید یورپی تہذیب و تمدن کو نہایت عمیق نگاہ سے دیکھتے اور اس بات کا بخوبی جائزہ لیتے کہ انہوں نے دیگر غریب و نادار اور کمزور اقوام کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا ہے تو انہیں اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ یہ معاشرے کہ جو افراد بشر کے ساتھ محبت و خیر خواہی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں اور اموال کے ذریعے نوع انسانی کی خدمت اور انہیں حریت و آزادی دلانے کے لئے کسی بھی قربانی و ایثار سے دریغ نہیں کرتے اور وہ مظلوم کی دادرسی و دستگیری کر کے انہیں ان کے پامال شدہ حقوق دلانا چاہتے ہیں اور انہیں غلامی کی قید سے آزاد کرنا چاہتے ہیں، تو واضح ہو جاتا کہ ان کے یہ دعوے بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں اور وہ اس طرح دیگر اقوام کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں، ان کا مطمع نظر اس کے سوا کچھ نہیں کہ کمزور و محروم قوموں کو جس طرح بھی ممکن ہو اپنے دست نگر بنائیں اور ان پر تسلط جمائیں چنانچہ کبھی فوجی طاقت و آمریت کے ذریعے کبھی استعماری ہتھکنڈے استعمال کر کے، کبھی ان کی سرزمین پر غاصبانہ قبضہ کر کے، کبھی ان کے حقوق کے ذمہ دار کہلا کر، کبھی مشترکہ مفادات کے تحفظ کے نام پر، کبھی ان کے استقلال کی پاسداری کے عنوان پر، کبھی صلح و امن کے قیام کے حوالہ سے، کبھی انہیں اغیار کے تسلط سے نجات عطا کرنے کے نام پر، کبھی ان کے حقوق اور ستمدیدہ افراد کی عظمت رفتہ کی بحالی کے نام پر، اور کبھی کسی دوسرے عنوان سے اپنے مخصوص اہداف تک رسائی کو ممکن بنانے کے درپے ہوتے ہیں۔ تو اس طرح کی سوچ اور طرز عمل کے حامل معاشروں کو کس طرح صالح معاشرے کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کے اعمال کو انسانی فطرت سلیمہ ہرگز پسند نہیں کرتی، اور کوئی صالح و سالم انسان ایسے معاشروں کو صالح معاشرے نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی ان کے بارے میں سعادت مندی کا تصور کر سکتا ہے خواہ وہ دین و مذہب اور وحی و نبوت پر عقیدہ نہ بھی رکھتے ہوں اور جس چیز کو ادیان الٰہی سعادت سے تعبیر کرتے ہوں وہ اس پر یقین ہی نہ رکھتے ہوں، لیکن انسانی اصول و اقدار کی بنیاد پر سوچیں تو ہرگز

ایسے معاشروں کو صالح معاشرے نہیں کہا جا سکتا، اور طبع انسانی کس طرح اس بات پر راضی ہو سکتی ہے کہ تمام افراد بشر انسانی حیثیت میں برابری کے حامل ہونے کے باوجود اپنی انسانی قدروں میں اس طرح اختلافات پیدا کریں کہ ان میں سے بعض افراد دوسرے افراد کی جان و مال کے مالک بن جائیں اور ان کی عزت و ناموس اور اموال پر ڈاکہ ڈالیں اور ان کے وجود و حیات کے تمام امور کو تہہ و بالا کر دیں یہاں تک کہ انہیں اس طرح کے سنگین حالت سے دوچار کر دیں کہ جس کی مثال سابقہ اقوام میں بھی نہ ملتی ہو اور نہ ہی گزرے ہوئے ادوار کا انسان اس طرح کی سختیوں میں گھرا ہو، ایسے معاشروں کو کس طرح صالح معاشرے کہا جا سکتا ہے، ہمارے ان بیانات پر ہمارے پاس ان کی تاریخ حیات ہی سب سے بہترین سند ہے کہ جس میں ان کے طرز عمل اور دوسرے معاشروں اور اقوام کے ساتھ ان کے برتاؤں بلکہ وحشیانہ سلوک کی کہانیاں درج ہیں کہ موجودہ نسل اب تک ان کے غیر انسانی اعمال کی زد میں ہے اس کے باوجود اگر ان معاشروں کو صالح و سعادت مند معاشرے کہا جائے تو یہ ڈھٹائی اور ڈھکوسلہ سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

(۲) اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تسلسل کی بنیادیں؟

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پایا جاتا کہ کسی بھی معاشرہ کی تشکیل اس یکتا غرض اور ہدف کی بنیاد پر ہوتی ہے جو اس معاشرہ کے گوناگوں افراد کے درمیان قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس واحد غرض و ہدف کی حیثیت درحقیقت اس روح جیسی ہے جو معاشرہ کے تمام پہلوؤں میں اس طرح موجود ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے اس معاشرہ میں ایک خاص نوعیت کی وحدت و اتحاد وجود میں آ جاتا ہے۔ البتہ اس طرح کا مشترک ہدف و مقصد عام طور پر ان غیر دینی بنیادوں پر تشکیل پانے والے معاشروں میں ملحوظ ہوتا ہے جن کا کعبۂ نگاہ صرف اور صرف انسان کی دنیاوی زندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور وہ ہدف و مقصد مشترک اور اجتماعی صورت میں ہوتا ہے انفرادی صورت میں نہیں ہوتا اور وہ ہدف اجتماعی طور پر مادی زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کا دوسرا نام ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادی زندگی کی لذتوں سے اجتماعی اور انفرادی دونوں صورتوں میں بہرہ ور اور لطف اندوز ہونے میں کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں میں خاصیت کے حوالہ سے فرق پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ اگر انسان تنہا زندگی بسر کر سکتا تو اپنی لذت اندوزیوں میں مطلق العنان ہوتا کیونکہ اس صورت میں کوئی اس کا مدمقابل اور رقیب ہی نہ ہوتا سوائے اس کی بعض ان جسمانی قوتوں کے کہ جو اس کی دیگر جسمانی قوتوں کی عملداری میں رکاوٹ بنتی ہیں مثلاً اس کا نظام

تنفس ،تو اس کا پھیپھڑا ہر ہوا کو برداشت نہیں کرتا بلکہ وہ خاص طرح کی ہوا چاہتا ہے، یہی حال معدہ کا ہے کہ انسان حد سے زیادہ غذا نہیں کھاسکتا کیونکہ اس کا نظام ہاضمہ اسے برداشت نہیں کرتا، اسی طرح دیگر جسمانی قوتیں اپنی عملداری میں مخصوص کیفیات رکھتی ہیں اوران کا دائرہ محدود ہوتا ہے، تو یہ صورت حال اس کے اپنے جسمانی نظام میں پائی جانے والی قوتوں کی ہے، جب اس کے وجودی قوتوں کا یہ حال ہے تو پھر اس کا دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق اگر اس کی انفرادی حیثیت میں دیکھیں کہ کوئی دوسرا شخص اس کی مادی زندگی میں اس کے ساتھ شریک نہ ہو تو اس کی راہ میں کوئی مانع وحائل بھی قابل تصور نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے کسی فعل وعمل میں محدودیت پیدا ہوگی ،لیکن اس کے برعکس اگر اس کی اجتماعی حیثیت کے حوالہ سے دیکھیں تو اس کی زندگی کا دائرۂ عمل اس قدر وسعت کا حامل نہیں ہوتا جیسا کہ انفرادی حیثیت میں ہوتا ہے لہذا وہ اپنے ارادہ وعمل میں مطلق العنان نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی آزادی دوسروں کی آزادی سے متصادم ہوجائے گی جس سے پورا معاشرہ تباہی سے دو چار ہو جائے گا۔ ہر فرد مطلق العنان بن کر اپنی لامحدود آزادی کا استعمال کرے تو اس کا نتیجہ پورے معاشرہ کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اس موضوع کی بابت ہم نبوت کی بحثوں یا دیگر اظہارات وبیانات میں وضاحت کے ساتھ مربوطہ مطالب ذکر کر چکے ہیں، اور یہ وہ اصل وجہ ہے جو معاشرے میں نظام حکومت کے ضروری ہونے کو یقینی بناتی ہے کہ اگر ہر شخص اپنی مطلق العنان حیثیت کے ساتھ ارادہ وعمل کرے تو معاشرہ تصادم کی ایسی خوفناک صورت حال کا شکار ہوگا کہ اس کی سلامتی کی ضمانت مشکل ہو جائے گی ، البتہ غیر متمدن معاشروں میں ایسا نہ تھا کہ ان کے دانشور اور عقلمند افراد غور وفکر کر کے اپنی معاشرتی حیثیت کا لائحہ عمل طے کریں بلکہ ان کے افراد کے درمیان لڑائی جھگڑے اور تنازعات اس قدر زیادہ ہوئے کہ وہ بالآخر کسی ضابطہ پر اتفاق کرنے پر مجبور ہو گئے ،تاہم ان کا اس طرح کے کسی ضابطہ پر متفق ہونا چونکہ کسی مضبوط ومستحکم بنیاد پر نہ تھا اس لئے اس میں نقض وترمیم کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا، اور عملی صورت میں ایسا ہوتا تھا کہ لوگ کسی بات کو اپناتے اور پھر جب اس کی اثر گزاری کا دائرہ تنگ ہوتا دیکھتے تو کسی دوسرے طریقہ کو اپنا لیتے جس کے نتیجہ میں معاشرہ لحہ بہ لحہ تبدیلیوں کی زد میں رہتا تھا، لیکن اس کے برعکس متمدن معاشروں میں جو اصول وضوابط متعین ہوتے تھے وہ ٹھوس بنیادوں پر استوار ہوتے تھے البتہ یہ سب کچھ ہر معاشرہ میں پائے جانے والے تمدن کے درجات ومراتب پر موقوف ہوتا تھا یعنی معاشرہ میں جس قدر تمدن پایا جاتا تھا اس کے مطابق ایسے قوانین وضع کئے جاتے تھے جن کی عملداری سے لوگوں کے ارادہ وعمل میں ممکنہ تضاد کا راستہ روکا جاسکے اور ہر فرد کے لئے مخصوص شرائط مقرر کی جائیں جن پر عمل کر کے معاشرے کی سلامتی کو یقینی بنایا جاسکے اور پھر ان قوانین پر عملدرآمد کو یقینی بنانے اور بھرپور بنیادوں کے ساتھ ان کے نفاذ واجراء سے مربوط امور کی انجام پذیری کے لئے ایک مرکز قائم کیا جاتا تھا تاکہ اس میں متعلقہ ضروری اقدامات اٹھائے جاسکیں، اور قانون کی صحیح سمت میں حکمرانی قائم ہو،

مذکورہ بالا مطالب سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ:

(۱) قانون ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جو لوگوں کے ارادوں اور اعمال کی یکسوئی کو یقینی بنا کر ان میں پیدا ہونے والے ممکنہ اختلاف و دوگانگی اور تزاحم و تصادم کو ختم کر سکے۔

(۲) معاشرے کے افراد کہ جن پر قانون کی حکمرانی ہوتی ہے وہ قانون کے دائرہ سے باہر، آزاد ہیں کیونکہ شعور و ارادہ کے حامل انسان کی طبع وجودی ہی اس بات ن متقاضی ہے کہ قانون کی عادلانہ پاسداری کے سایہ میں فطری آزادی سے بہرہ ور ہو اور اس طرح ارادہ و عمل کے درمیان پائے جانے والے قوانین میں دینی معارف و اخلاقی مسائل کو درخور توجہ قرار نہیں دیا جاتا اور ان دو نہایت اہم امور کو قانون کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں تدریجی طور پر اور قانون کی حاکمیت کے سایے میں عقائد و اخلاق پر بھی قانون ہی کا رنگ چھا جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ معنویات کی نورانیت چھٹ جاتی ہے اور وہ صرف ظاہری و خشک صورت میں باقی رہ جاتی ہے، اسی وجہ سے دین کے ساتھ سیاست بازی کے مظاہر ہر روز دیکھنے میں آتے ہیں کہ کبھی تو دینی اقدار و اصولوں کی پامالی مقصود قرار پاتی ہے اور کبھی اس کا سہارا لینے کے لئے اعلاء کلمۂ حق کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے اور کبھی اسے نظر انداز کرتے ہوئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

(۳) معاشرہ میں قانون کی حکمرانی کے مذکورہ بالا طریقہ میں بھی خامی پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں اگر چہ قانون کے اجراء و نفاذ کی ضمانت بظاہر اس مرکزی طاقت کے پاس ہوتی ہے جس پر کسی ایک فرد یا افراد کا قبضہ ہوتا ہے لیکن نتیجتاً اس کی عملداری و نفاذ کی حقیقی ضمانت نہیں پائی جاتی اور وہ اس طرح کہ اگر وہ مرکزی طاقت و سرچشمہ سلطنت و اقتدار حق سے روگرداں ہو جائے اور عوامی اقتدار کو شخصی حکومت میں بدل دے تو کوئی طاقت اسے اس کام سے باز نہیں رکھ سکتی اور اسے عدل و انصاف کی حکمرانی کو یقینی بنانے کی راہ پر نہیں لا سکتی، اس تلخ حقیقت کے شواہد کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہم نے اپنے ہی زمانہ میں اس کی مثالیں دیکھی ہیں جبکہ یہ زمانہ ثقافت و ترقی اور تمدن کا زمانہ کہلاتا ہے، اور اس کی مثالیں تاریخ کے اوراق میں بھری ہوئی ہیں کہ جن کا شمار ہی نہیں ہو سکتا، اس خامی کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خامی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ قانون شکنی کے موارد کبھی تو خود ارباب اقتدار ہی سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور کبھی ان تک رسائی ہی ارباب اقتدار کے بس میں نہیں ہوتی،

بہر حال اب ہم پہلی بات کی طرف لوٹتے ہیں اور خلاصہ کلام کے طور پر کہتے ہیں کہ جدید تمدن کے رسیا معاشروں میں صرف ایک ہی غرض و غایت ملحوظ ہے اور وہ ہے دنیاوی زندگی کی لذتوں سے بہرہ مند و لطف اندوز ہونا، کہ جسے وہ اپنے تئیں ''سعادت'' قرار دیتے ہیں، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ دنیاوی زندگی ہی کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کو ''سعادت'' قرار نہیں دیتا بلکہ اس کی نظر میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے کہ جس کی کڑیاں مادی دنیا کی زوال پذیر زندگی سے باہر اخروی زندگی تک جاتی ہیں جو کہ اصل زندگی ہے یعنی اس کا ایک پہلو اسی دنیاوی زندگی کی لذتوں سے لطف اندوزی ہے کہ حقیقی معنی میں وہی ''زندگی'' ہے، اور اسلام اس حقیقی زندگی کی سعادت کا حصول صرف انہی معارف الہیہ سے وابستگی و پیوستگی

سے ممکن قرار دیتا ہے جس کی اصل واساس توحید و یکتا پرستی ہے، اسلام کی نگاہ میں ان معارف الٰہیہ سے وابستگی و پیوستگی کا راز پاکیزہ اخلاق و کردار اور نفس کے ہر طرح کی گندگی و برائی سے پاک ہونے میں مضمر ہے، اور پھر ان اخلاق و اعلیٰ سیرت کا کامل و مکمل ہونا اس صالح اجتماعی زندگی پر موقوف ہے جس کی بنیاد خداوند عالم کی خالصانہ عبادت اور اس کی ربوبیت کے تقاضوں کی عملی تکمیل اور لوگوں کے ساتھ معاشرتی عدل کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے، اسی بنیاد پر اسلام نے انسان کی دنیوی و اخروی سعادت کو یقینی بنانے کے لئے اپنے اصلاحی دستورات کا سرنامہ دعوتِ توحیدی کو قرار دیا تاکہ تمام افراد بشر ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہوئے وحدت کی لڑی میں پرو جائیں چنانچہ اسلام نے اسی توحیدی بنیاد پر اپنے قوانین کی صورت گری کی اور اس سلسلہ میں ارادوں کی یکسوئی وہم رنگی پر اکتفا کرنے کی بجائے عبادتی احکام کے ذریعے ان کی تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ معارف حقہ اور پاکیزہ اخلاق کا اضافہ کر دیا...... کہ اس میں علمی و عملی دونوں حوالوں سے انسان کی عظمت و سعادت کی ضمانت پائی جاتی ہے...... اس تدوینی مرحلہ کے بعد اسلام نے ان قوانین کے اجراء و نفاذ کی ذمہ داری سب سے پہلے اسلامی حکومت پر ڈالی کہ وہ اس سلسلہ میں متعلقہ امور کی درست انجام دہی کو یقینی بنائے، اس کے بعد اسلام نے معاشرہ کو اس کا ذمہ دار قرار دیا کہ وہ صالحانہ علمی و عملی تربیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے ان قوانین و دستورات کی پاسداری کو یقینی بنائے، دین اسلام کے اہم ترین امتیازات اور خصوصیات میں جو چیز عام مشاہدہ میں آتی ہے وہ افراد معاشرہ کے درمیان کامل وحدت وہم رنگی کے قیام کے لئے باہمی تعلق و ارتباط کو مستحکم کرنا ہے اور وہ اس طرح کہ یہ مقدس دین جن پاکیزہ اخلاق کی طرف بلاتا ہے ان سب میں توحیدی روح موجود ہے اور جن اعمال کی انجام دہی افراد معاشرہ پر لازم قرار دیتا ہے ان میں اخلاقی روح پھونکی گئی ہے، بنابرایں دین اسلام کے تمام اجزاء و احکامات کے کامل تجزیہ و تحلیل سے ثابت ہوتا ہے کہ ان سب کی بازگشت توحید کی طرف ہوتی ہے کہ جو اخلاق و اعمال کے مجموعہ مرکب سے عبارت ہے اور ان دونوں کے درمیان نزولی و صعودی تعلق اس طرح پر ہے کہ نزولی حوالہ سے وہ اعمال و اخلاق ہی ہیں اور صعودی حوالہ سے وہ توحید بنتی ہے چنانچہ اسی مطلب کا تذکرہ قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہوا "إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ" (خدا کی طرف پاکیزہ کلام صعود کرتا ہے اور عمل صالح اسے بلند تر کر دیتا ہے......) (سورہ فاطر آیت: ۱۰)

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: عام معاشرتی قوانین کے بارے میں جو اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کے اجراء و نفاذ کی ذمہ دار قوتیں ان کی عملداری کو یقینی بنانے میں ناکام ہوئی ہیں یا یہ کہ ان قوانین کی مخفی خلاف ورزی کے ارتکاب سے ناآگاہ ہوتی ہیں یہی اعتراض بعینہ اسلامی

قوانین کے اجراء ونفاذ کی ذمہ دار قوتوں پر آتا ہے چنانچہ اس مطلب کی واضح وروشن ترین دلیل یہ ہے کہ ہم خود دین کی کمزوری اور اسلامی معاشرے میں اس کی بالادستی کا زوال اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کررہے ہیں اور اس صورتحال کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت موجود نہیں جو اس کے قوانین واقدار کو ایک دن کے لئے بھی لوگوں پر نافذ کرسکے۔

جواب: عمومی قوانین خواہ خدائی ہوں یا انسانی ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کے اذہان میں ثبت کی گئی صورتیں ہیں اور ایسے علوم ہیں جو سینوں میں محفوظ ہوتے ہیں یعنی لوگوں کے اذہان اور دل ان قوانین اور صورتوں کی آماجگاہ ہیں اور ان صورتوں کو عملی قالب میں ڈھالنا لوگوں کے ارادوں پر موقوف ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو قوانین کی عملداری کا کوئی نشان معاشرے میں دکھائی نہ دے گا، تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل واساس اور حقیقی بنیاد لوگوں کے ارادے ہیں کہ جو قوانین کو عملی صورتوں میں بدلتے ہیں کہ ان کے بغیر کسی بھی قانون کو عملی صورت حاصل نہیں ہوسکتی، لہٰذا کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے ارادے ان قوانین کو عملی صورت میں ڈھالنے کی راہ پر آئیں اور وہ قوانین کی اصل حقیقت کو عملی وجود دیں، اور جہاں تک عام رائج قوانین کا تعلق ہے تو ان میں اس سے زیادہ کسی چیز کو اہمیت نہیں دی گئی کہ لوگوں کے افعال کی بنیاد اکثریت کا فیصلہ وارادہ ہو یعنی جس چیز کا ارادہ وفیصلہ اکثریت کرے تمام افراد اسی کو اپنائیں، لیکن اکثریت کے ارادے کی بقا وتسلسل کے حوالہ سے کوئی ٹھوس اقدامات بجا نہیں لائے گئے، بنابرایں جب تک ارادے زندہ ومتحرک ہوں تو ان کی بنیاد پر قانون کی عملداری یقینی ہوتی ہے اور اگر معاشرتی انحطاط واخلاقی بحرانوں کے باعث ارادوں میں جان ہی باقی نہ رہے اور اگر ان میں جان موجود بھی ہو لیکن ان میں شعور وادراک کا فقدان ہو اور معاشرے میں عیاشیوں واوباشیوں کے امڈے ہوئے طوفان کے باعث ارادوں میں قوانین پر عمل کرنے کے جذبے مردہ ہوجائیں یا اگر جذبے مردہ نہ بھی ہوں لیکن اکثریت کے ارادوں پر غالب استبدادی حاکموں کے جابرانہ تسلط کے نتیجہ میں اپنی اثرگزاری سے محروم ہوجائیں، اور اسی طرح ان حوادث میں جن کی روک تھام کے لئے حکومت بے بس ہو جیسے چھپ کر انجام دیئے جانے والے جرائم وغیرہ یا وہ واقعات کہ جن پر قابو پانا حکومت کی دسترس سے باہر ہو تو ان تمام موارد میں امت، قانون کی عملداری اور معاشرے کو تباہی وبربادی سے بچانے کی اپنی تمنا کو پورا نہیں کرسکتی، چنانچہ اس کی واضح وروشن ترین مثال پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے بعد یورپی اقوام کی ٹوٹ پھوٹ ہے کہ جو انسانی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے، اور ان تمام حالات یعنی قوانین کی خلاف ورزیوں اور معاشرے کی تباہی وبربادی کا اصل سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشرے میں اس بنیادی عامل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی جو لوگوں کے ارادوں کی طاقت اور ان کی اثرگزاری کی اہمیت کو تحفظ فراہم کرتی ہے یعنی اعلیٰ وپاکیزہ اخلاق! کیونکہ اعلیٰ اخلاق کے بغیر ارادوں کی بقاء اور ان میں جذبوں کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا اور کوئی ارادہ اپنے موزوں اخلاق کے بغیر اپنی عملی صورتگری سے ہمکنار نہیں ہوسکتا جیسا کہ علم النفس میں اس حوالہ سے واضح کردیا گیا ہے، لہٰذا اگر معاشرے میں رائج طور طریقے اور قانون کی

حکمرانی وعملداری اعلیٰ و پاکیزہ اخلاق کی مضبوط بنیاد پر قائم واستوار نہ ہو تو ان کی مثال اس درخت جیسی ہوگی جو زمین سے از خود نکلا کہ جسے قرار حاصل نہیں ہوتا۔

مذکورہ بالا تلخ حقائق کا ایک واضح ثبوت کیمونزم کا دنیا میں ظہور پذیر ہونا ہے کہ جو ڈیموکریسی ہی کی پیداوار ہے اور اسے معاشرے میں مترفہ و مالدار طبقہ کی عیاشیوں اور دیگر افراد کی محرومیوں نے جنم دیا ہے جو رفتہ رفتہ دونوں طبقوں کے درمیان وجود میں آنے والی دوریوں اور وسیع فاصلوں کا باعث ہوا کیونکہ مترفہ و مالدار طبقہ کی طرف سے قساوت وسنگدلی اور محروم طبقہ کے بارے میں ناانصافی کے پے در پے عملی مظاہروں نے معاشرے میں ناراضگی و ناراضایتی اور غصہ ودشمنی کی آگ کے شعلے بھڑکا دیئے، اسی طرح عالمی جنگوں کا یکے بعد دیگرے دو مرتبہ وقوع پذیر ہونا جبکہ تیسری مرتبہ اس کے بادلوں کا گرجنا روئے زمین پر تباہی اور املاک ونسلوں کی بربادی کا سبب بن چکا ہے کہ جس کے پیچھے استکباری سوچ اور طمع ولالچ جیسے عوامل کارفرما ہیں، اور یہ سب کچھ موجودہ قوانین کی کمزور بنیادوں کے ناقابل انکار آثار ہیں جبکہ اسلام نے اپنے تمام دستورات و احکام اور قوانین وضوابط کو اعلیٰ ترین اخلاق و پاکیزہ ترین صفات پر قائم واستوار کیا اور انہی پر لوگوں کی تربیت کا وسیع نظام تشکیل دیا ہے البتہ جہاں تک ان قوانین کی عملداری کا تعلق ہے تو اس کا فیصلہ اور بنیادی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں ان قوانین پر عمل کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتا ہے اور اپنی خلوت وجلوت اور ظاہر وباطن میں ان احکامات ودستورات کی عملی پاسداری کا فریضہ کسی دوسرے کی نگرانی کے بغیر نہایت احسن انداز میں ادا کر سکتا ہے۔

اس مقام پر یہ مطلب قابل ذکر ہے کہ مغربی ممالک میں بھی لوگوں کو پاکیزہ اخلاق واعلیٰ کردار اپنانے کی ضرورت پر بھرپور انداز میں تاکید کی جاتی ہے اور اس مقصد کے لئے ہر ممکن وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان صفات کو اپنا کر معاشرے کو عزت ووقار سے مالا مال کر سکیں لیکن ان کی کوششیں نتیجہ بخش ثابت نہیں ہوتیں اور اس کی دو وجوہات ہیں:

(۱) اخلاقی برائیوں کا واحد سبب وعامل ایک طرف مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں اسراف وزیادہ روی اور افراط ہے جبکہ دوسری طرف اس سے محرومیت ہے، یعنی ایک گروہ کا اس حوالہ سے بھرپور آزادی کے ساتھ استفادہ کرنا اور دوسروں کا اس سے پورے طور پر محروم ہونا ہے، اس افراط ومحرومیت نے معاشرے میں اخلاقی برائیوں کو جنم دیا ہے چنانچہ مغربی قوانین نے لوگوں کو اس سلسلہ میں مکمل آزادی دی جس نے کچھ لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا اور کچھ کو محرومی سے دوچار کر دیا، تو کیا اس صورت حال میں پاکیزہ اخلاق اپنانے کی دعوت وترغیب دلانے کی بات کرنا دو متضاد چیزوں کی طرف بلانا نہیں کہلائے گا اور دو ایسے امور کو طلب کرنا نہیں کہلائے گا جو باہم یکجا نہیں ہو سکتے؟

اس کے علاوہ آپ آگاہ ہو چکے ہیں کہ اہل مغرب اجتماعی سوچ کے حامل کہلاتے ہیں اور ان کے معاشروں میں ہمیشہ کمزور معاشروں کو مزید کمزور کرنے اور ان کے حقوق کو پامال کرنے کی بابت کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی جاتی اور ان کی تمام تر

توانائیاں لوگوں کے وسائل کو اپنے مفادات وعیاشیوں میں استعمال کرنے، انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے اور ممکن حد تک ان پر اپنی بالادستی کا دائرہ وسیع تر کرنے ہی میں صرف ہوتی ہیں تو اس طرح کے حالات میں نیکی وتقویٰ اور اچھی صفات اپنانے کی دعوت دینا متناقص اور متضاد دعوت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا جو کہ یقیناً ہمیشہ بے نتیجہ ہوتی ہے۔

(۲) پاکیزہ اخلاق کا نفوس بشری میں ثبات واستقرار کسی ایسے مضبوط سہارے وضامن کے بغیر ممکن نہیں جو اس کے تحفظ وتسلسل کو یقینی بنائے اور وہ توحید کے سوا کچھ نہیں، یعنی توحید ہی ہے جو پاکیزہ اخلاق وثبات واستقرار عطا کرسکتی ہے اور توحید سے مراد یہ عقیدہ ونظریہ ہے کہ کائنات کا ایک ہی معبود ہے جس کے پاکیزہ اسماء (الاسماء الحسنیٰ) ہیں اور اس نے مخلوق کو اس لئے خلق فرمایا کہ اسے مال وسعادت سے مالا مال کرے، وہ خیر وبہتری کو پسند کرتا ہے اور شر وبرائی کو ناپسند کرتا ہے، وہ خدائے واحد ویکتا بہت جلد تمام مخلوق کو ایک جگہ (قیامت کے دن) اکٹھا کرے گا اور ان کے درمیان حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا، نیک وصالح شخص کو جزا اور برے وبدکار کو سزا دے گا، اور یہ ایک واضح ومسلم امر اور حقیقت ہے کہ اگر معاد وقیامت کا عقیدہ نہ ہو تو حقیقی معنی میں کوئی ایسا ٹھوس عامل نہیں جو انسان کو نفسانی خواہشات کی پیروی اور مادی لذتوں کی آلودگی سے روکے اور بچائے کیونکہ طبع انسانی صرف اسی چیز کو پسند کرتی ہے جس سے وہ خود لطف اندوز ہو، اس کے علاوہ اسے کسی دوسرے کی پرواہ نہیں ہوتی اور اگر وہ کسی دوسرے انسان کی طبع وجودی کو کسی حوالہ سے اہمیت بھی دیتی ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی بازگشت خود اس کی طرف ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ اسے ہی حاصل ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ہرگز اسے درخور اعتناء قرار نہیں دیتی، (اس موضوع پر اچھی طرح غور کریں)، بنابرایں جن چیزوں میں انسان کے لئے لطف اندوزی ولذت پانے کا سامان موجود ہو مثلاً دوسروں کے حقوق میں سے کسی حق کو پامال کرنا کہ جس سے روکنے والا کوئی بھی نہ ہو اور نہ ہی کوئی سزا دینے والا یا ملامت کرنے والا ہو تو اس صورت میں خطا کی وادی میں گرنے اور بڑے سے بڑے گناہ ومعصیت کے ارتکاب سے کون روک سکتا ہے؟ اور اس حوالہ سے ایک توہم وغلط فہمی عوام وخواص...... کہ جن میں اکثر اہل دانش بھی ہیں...... میں پائی جاتی ہے کہ وطن دوستی، ہمنوع دوستی اور اچھی تعریفیں وغیرہ برائی کے ارتکاب کی راہ میں رکاوٹیں بن سکتی ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ امور قلبی عواطف واحساسات اور باطنی جذبات ہیں کہ جن کا تحفظ تعلیم وتربیت کے سوا کسی دوسرے سبب سے ممکن نہیں اور ان کی اثر آفرینی کسی معین ومتعین عامل سے وابستہ نہیں ہوتی لہٰذا ان کی حیثیت اتفاقیہ اوصاف اور معمولی امور سے زیادہ نہیں کہ جن کی زوال پذیری میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی، تو اس صورت حال میں کیا ضرورت ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس لئے قربان کردے کہ اس کے مرنے کے بعد دوسرے لوگ لذتیں اٹھائیں اور دنیا کی عیش وعشرت سے مزے لوٹیں جبکہ وہ خود اس حقیقت سے آگاہی رکھتا ہو کہ موت فناء ونابودی ہے؟ یہ کونسی عقلمندی ہے کہ انسان اس لئے اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کی تعریف کریں؟ وہ اپنے مرنے کے بعد لوگوں کی طرف سے اپنی

تعریف سن کر اس سے لطف اندوز کیونکر ہو سکتا ہے؟

خلاصہ کلام یہ کہ کوئی دانشمند و مفکر اس حقیقت کے بارے میں کسی طرح کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان ایسی چیز سے محرومی کا اقدام نہیں کر سکتا جس سے محرومی اسے کوئی فائدہ نہ دے سکے خواہ اس محرومی پر اس کی تعریف ہی کیوں نہ ہو اور اس کے بارے میں اس سے وعدے بھی کئے جائیں...... یعنی اس سے کہا جائے کہ تمہارے مرنے کے بعد تمہارا تذکرۂ جمیل عام ہوگا اور تمہیں یہ فائدہ ہوگا اور وہ فائدہ ہوگا...... اور اس سے کہا جائے کہ تمہارا نام سربلند ہوگا تم تاریخ میں ہمیشہ زندہ و جاوید رہو گے، ہر شخص کی زبان پر تمہارا ہی نام ہوگا وغیرہ وغیرہ، تو اس طرح کے ہوائی وعدے دراصل فریب و دھوکہ کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور کسی کے جذبات واحساسات سے کھیلنے سے زیادہ ان کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ ان دلفریب وعدوں کی بنیاد پر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ مرنے اور اپنی جان فدا کرنے کے بعد بھی اسی طرح ہوگا جیسے زندگی میں ہے کہ اپنے تذکرۂ جمیل سے لطف اندوز ہوگا اور اپنی نیک نامی سے سربلند ہوگا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ غلط وتوہم پر مبنی ہے اور بعینہ اسی طرح سے ہے جیسے نشہ میں سرمست انسان غیر متوازن حرکتیں کرتا ہے اور احساسات کی برانگیختی کا شکار ہو کر اپنی عزت و ناموس اور مال و دولت بلکہ ہر طرح کے شرف و اعزاز کو پامال کر دیتا ہے کہ اگر عقلمند ہوتا اور فکری صحت مندی کا حامل ہوتا تو کبھی غیر متوازی کام انجام نہ دیتا لیکن وہ نشہ کی حالت میں بے شعوری و نا سمجھی کے ساتھ بیوقوفانہ حرکتیں کرتا ہے جس سے اس کے جنون و دیوانہ پن کا ثبوت ملتا ہے، تو اس طرح کی لغزشوں اور فکری و عملی ٹھوکروں سے بچنے کا صرف اور صرف ایک ہی سہارا ہے یعنی توحید، کہ جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں کہ توحید ہی وہ مضبوط قلعہ ہے جو انسان کو غیر معقول حرکتوں سے بچا سکتا ہے، چنانچہ اسی مقصد کے لئے اسلام نے پاکیزہ اخلاق کا ایک نہایت اہم اور ٹھوس نظام مقرر کیا ہے اور اسے اپنی توحیدی بنیادوں پر استوار کرتے ہوئے اپنے آئین کا لازمی جزء بنایا ہے کہ جس کے بنیادی تقاضوں میں سے معاد و عقیدۂ قیامت ہے اور اس کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ انسان نیکی واحسان کا رسیا ہو جائے اور برائی و بدی سے اجتناب برتنے کا پابند ہو خواہ جہاں بھی ہو اور جب اور جن حالات میں بھی ہو، جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، کوئی اس کے اچھے کام پر اس کی تعریف کرنے والا اس کے ساتھ ہو یا نہ ہو، کوئی اس کے برے کام سے روکنے والا اس کے پاس ہو یا نہ ہو، اسے ان چیزوں کی ہرگز پرواہ نہیں ہوتی اور وہ ان امور کو خاطر میں لاتا ہی نہیں کیونکہ وہ ہر حال میں خداوند عالم کو اپنے پاس سمجھتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا معبود اس کے ہر کام کو جانتا اور اس کی حفاظت کرنے والا بلکہ ہر شخص کے عمل کا ناظر ہے اور یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ اس عالم کے بعد ایک دن ایسا بھی آئے گا جس میں ہر شخص اپنے کئے کا مشاہدہ کرے گا اور اپنے ہر عمل خواہ اچھا یا برا کی جزا پائے گا...... تو ظاہر ہے کہ توحید اور معاد کے عقیدے کے بعد کوئی شخص برائی و بدی کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور نہ ہی دنیا کی چمک دمک اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے بلکہ وہ توحید و یکتا پرستی کے عقیدے کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر نہایت پاکیزگی اور عزت و وقار کے ساتھ طے کر سکتا ہے۔

۷۔ دو فکری زاویے: تعقل و احساس

انسان کی زندگی میں دو فکری زاویے پائے جاتے ہیں جو اس کے سفر حیات کی جہتوں کو متعین و مشخص کرتے ہیں: (۱) زاویہ تعقل (۲) زاویہ احساس، جہاں تک زاویہ احساس کا تعلق ہے تو اس کا دائرہ مادی فوائد سے باہر نہیں ہوتا بلکہ وہ مادی فوائد کے حصول کی طرف جذب کرتا ہے اور اگر اس کا مقصد پورا ہو جائے اور انسان اس کے مطابق عمل کرنے لگے تو اس کی طرف مزید بڑھتا چلا جاتا ہے اور انسان اس کے نشہ میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ پھر اسے دنیا میں مادی فوائد کے حصول کے علاوہ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی لیکن اگر اس کی اثر گزاری انسان کو متاثر نہ کر سکے اور وہ ان مادی فوائد سے دل نہ لگائے تو یا ان کی لطف و لذت آفرینی اسے اپنا اسیر نہ کر سکے تو وہ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے جبکہ اس کے مقابل زاویہ تعقل انسان کو حق کے اتباع و پیروی کی طرف کھینچتا ہے اور پھر انسان وہی کچھ انجام دیتا ہے جو حق ہوتا ہے اور حق جس کا تقاضا کرتا ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ انسان ہر اس عمل کو انجام دینے کو اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے مفید ہو خواہ وہ کام مادی فائدہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو وہ اس بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتا، اس کی نظریں حق و حقیقت پر جمی ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی خیر و بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

ان دو فکری زاویوں کے تناظر میں عرب کے مشہور شاعر ''عنترہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کریں جو زاویہ احساس کی ترجمانی کرتا ہے اور آیات قرآنیہ کا مطالعہ کریں جو زاویہ تعقل کی عکاسی کرتی ہیں:

شاعر عنترہ کا شعر یوں ہے:

وقولی کلما جشأت و جاشت　　　　مکانك تحمدی او تستریحی

اس شعر میں وہ کہنا چاہتا ہے کہ جب آتش جنگ شعلہ ور ہوتی ہے اور میدان کارزار گرم ہوتا ہے تو میں اپنا دل بہلانے کے لئے اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ ثابت قدم رہو کہ اگر مارے جاؤ تو لوگ تمہارے ثابت قدم رہنے اور میدان سے فرار نہ کرنے پر تمہاری تعریف کریں گے اور اگر تم نے دشمن کو پچھاڑ دیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تو تم سکون قلب پاؤ گے، لہذا ثابت قدم رہنا ہی تمہارا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے کیونکہ فتح و شکست دونوں صورتوں میں تمہارا فائدہ ہے۔

اور زاویہ تعقل کے حوالہ سے یہ آیات ملاحظہ ہوں،

سورۂ توبہ آیت: ۵۲

○　قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۞ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَیَیْنِ ۗ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ یُّصِیْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَیْدِیْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ

(کہہ دیجئے کہ ہمارے ساتھ صرف وہی ہوگا جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے کہ وہی ہمارا مولا و آقا ہے اور

ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ کیا تم دونیکیوں میں سے ایک ہی کا ہمارے لئے انتظار کرتے ہو جبکہ ہم تو صرف یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے یا تمہارے ہاتھوں تم پر عذاب نازل ہو، پس تم اپنا انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ اپنا انتظار کرتے ہیں)

سورہ توبہ آیت: ۱۲۰۔۱۲۱

○ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

(یہ اس لئے ہے کہ انہیں اللہ کی راہ میں جس پیاس، تھکن اور بھوک کا سامنا ہوا اور ان کی رفتار سے کافر غیظ وغضب میں آئے اور دشمنوں سے جو پالا پڑا ان سب کے عوض ان کے نامہ اعمال میں ایک ایک نیک عمل لکھ دیا گیا ہے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا ○ اور جو چھوٹا بڑا خرچ کرتے ہیں اور رضائے الٰہی کے لئے جس قدر سفر کرتے ہیں وہ ان کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے تا کہ اللہ انہیں ان کے نیک اعمال کی بہتر جزا عطا کرے)

اس بناء پر وہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہمیں قتل کر دو یا تمہاری طرف سے ہم پر کوئی مصیبت آئے تو اس سے ہمارے پروردگار کے پاس ہمارے لئے عظیم اجر اور نیک انجام ہے، اور اگر ہم نے تمہیں قتل کر دیا یا تم پر کسی طرح قابو پالیا تب بھی ہمیں عظیم ثواب اور نیک انجام کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنے دشمنوں پر فتح پانے کا اعزاز حاصل ہو جائے گا، لہٰذا ہم ہر حال میں سعادت مند ہیں اور لوگ ہم پر رشک کریں گے اور ہمارے ساتھ جنگ کرنے میں تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا، گویا ہمارے حوالہ سے تم دونیکیوں میں سے کسی ایک کے حصول کے منتظر ہو، اس بناء پر ہم ہر حال میں نیکی وسعادت کے حامل ہیں جبکہ تم ہمیں ظاہری طور پر شکست دینے کے بعد اپنے خیال میں اپنے آپ کو سعادتمند سمجھتے ہو اور اپنے تئیں یہ نظریہ رکھتے ہو کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہو، اس تمام صورت حال میں ہم تمہارے لئے برے انجام اور سخت عذاب میں مبتلا ہونے کی امید رکھتے ہیں جبکہ تم ہمارے لئے خوشی وسعادت کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔

تو یہ دو زاویہ ہائے فکر وعمل ہیں کہ جن میں سے ایک جنگ میں ثابت قدمی اور اپنے نظریہ پر قائم رہنا اور ہرگز پیچھے نہ ہٹنا ہے جو کہ نظریہ احساس پر مبنی ہے کہ جس میں دو نتائج ملحوظ ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ تعریف کریں گے اور دوسرا دشمن سے چھٹکارا مل جائے گا۔ البتہ یہ اس صورت میں امکان پذیر ہے جب جنگ کرنے والے شخص کو اپنی جان جوکوں میں ڈالنے اور موت سے ٹکر لینے میں کوئی فائدہ حاصل ہو لیکن اگر اسے اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو مثلاً لوگ اس کی تعریف نہ کریں کیونکہ وہ جہاد کی قدر و قیمت سے آگاہی نہیں رکھتے اور ان کے نزدیک خدمت وخیانت دونوں برابر ہیں یا جسے وہ خدمت سمجھتا ہے لوگ اس کی اہمیت کا ادراک ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی اسے خدمت وخیانت کے تقابلی باب میں شمار کرتے ہیں یا وہ خود دشمن

کو ہلاک کرنے سے کسی طرح کی خوشی محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ صرف حق کے لئے موجب مسرت ہو، تو ان تمام صورتوں میں زاویہ احساس کی بناء پر کسی عمل کا نتیجہ اپنی توانائیوں سے محرومی کے سوا کچھ نہیں۔

مذکورہ بالا موارد ہی ہیں جو ہر بغاوت وخیانت اور جرم وجنایت کے عمومی اسباب قرار پاتے ہیں اور ان کی بناء پر قانون کو پامال کرنے والا خائن شخص کہتا ہے کہ اس کی خدمت لوگوں کے نزدیک خاطر خواہ مقام نہیں رکھتی اور وہ اسے احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے اور ان کی نگاہ میں خادم وخائن دونوں یکساں ہیں بلکہ خائن کو خادم سے زیادہ عیش وعشرت حاصل ہے، اور ہر باغی ومجرم اپنے تئیں یہ تصور کرتا ہے کہ قانون اسے اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا اور نہ ہی قانون نافذ کرنے والے ادارے اس پر قابو پا سکتے ہیں چنانچہ اسی بناء پر وہ اپنے امور پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنا معاملہ لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اسی طرح ہر وہ شخص جو قیام حق اور دشمنانِ حق کے مقابلے میں آنے کے لئے بہانے تراشتا ہے وہ اپنے مؤقف کی صحت کے اثبات میں یہ کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ حق کا ساتھ دینا میرے لئے لوگوں میں باعث ذلت ہے اور موجودہ دور میں لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے قدیم زمانے اور قرونِ وسطیٰ کی یادگار قرار دیں گے، اور اگر میں شرافت نفس وطہارت باطن کی بات کروں تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس شرافت نفس سے کیا ملے گا جب اس کے نتیجہ میں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

تو یہ سب کچھ زاویہ احساس کی پیروی کے مظاہر ہیں، لیکن دوسری جانب زاویہ تعقل جو کہ اسلامی منطق ومؤقف ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے کیونکہ اسلام نے اپنی منطق ومؤقف کو اتباع حق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وجزاء کی تمنا پر مبنی قرار دیا ہے اور دنیاوی اغراض ومقاصد کے حصول کو قانونی حیثیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اور یہ بات واضح ومعلوم ہے کہ یہ غرض وغایت ہر مورد میں پائی جاتی ہے اور کوئی مورد اس کے دائرہ سے باہر نہیں، اس کی انجام پذیری صرف رضائے الٰہی پر مبنی ہوتی ہے اور حق کے معاملے میں سر تسلیم خم کرنے اور حق کی پیروی ہی اس کی اصل واساس قرار پاتی ہے کہ جو خداوند عالم وعلیم اور حافظ وحفیظ نے اپنی مخلوق سے طلب کی، وہ خدا کہ جسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اور نہ ہی کوئی طاقت اس کے عذاب سے بچا سکتی ہے، اور نہ ہی زمین وآسمان میں کوئی چیز ایسی ہے جو اس سے پوشیدہ ہو، چنانچہ اس کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ" (اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر وآگاہ ہے) لہٰذا ہر شخص پر ایک نگران وگواہ مقرر کر دیا گیا ہے جو اس کے ہر کام کو دیکھتا ہے خواہ وہ خود اس کام کو انجام دے یا کوئی دوسرا اس کے ساتھ سلوک کرے، خواہ لوگ اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں، خواہ لوگ اس کے اچھے کام پر اس کی تعریف کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، خواہ اس کے برے کام پر اس کی مذمت وسرزنش کریں یا نہ کریں اور خواہ کسی برے کام سے اسے روکیں یا نہ روکیں، وہ نگران ومحافظ ان تمام امور کا گواہ ہے، چنانچہ اس زاویہ فکر کی صحت ودرستی کی گواہی اس اسلامی تربیت کے خوبصورت آثار کی شکل میں ہمارے سامنے ہے کہ عہد نبویؐ میں لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنے گناہوں وغلطیوں کا برملا اعتراف کرکے توبہ کرتے تھے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ اپنے جرائم کی سزا پانے اور حد جاری کئے جانے کو (خواہ قتل کی صورت میں کیوں نہ ہو) اپنے لئے باعث خیر قرار دیتے تھے کیونکہ وہ چاہتے

تھے کہ ان کا پروردگار ان سے راضی وخوش رہے اور وہ گناہوں کی اس گندگی اور برائیوں کی اس پلیدی سے پاک ہو جائیں جس نے ان کے نفوس کو آلودہ کر دیا ہے، ان نادر موارد میں غور وفکر کرنے اور ان کا بخوبی جائزہ لینے کے بعد ہر دانشمند ومحقق کے لئے اس حقیقت سے آگاہی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے کہ دینی تعلیمات لوگوں کے نفوس میں کس قدر اثر کرتی ہیں اور انہیں رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنی پسندیدہ ترین لذتوں سے محروم ہونے پر راضی وعادی بنا دیتی ہیں، اگر تفسیری سلسلہ بحث ہمارا موضوع نہ ہوتا تو ہم یہاں تاریخی مثالیں وشواہد ذکر کرتے جن سے ہمارا مقصود ومطلوب مزید واضح وآشکار ہو جاتا۔

۸۔ خدا سے اجر طلب کرنا اور غیر خدا سے روگردانی

بعض سادہ لوح افراد یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اخروی اجر وجزا کو انسان کی معاشرتی زندگی کی غرض وغایت اور مقصد اعلیٰ قرار دیا جائے تو اس سے ان تمام مقاصد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے جو انسانی زندگی کی طبعی ضرورتوں کے بنیادی تقاضے ہیں اور ان مقاصد سے محرومی اجتماعی زندگی کی تباہی اور دنیا سے کنارہ کشی (رہبانیت) کا سبب بنتی ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک مقصد کو ملحوظ وہدف قرار دینے کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم مقاصد کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے؟ یعنی ایک ہی عمل میں دونوں مقاصد کا حصول ہدف ومقصد اعلیٰ قرار پائے؟ کیا یہ متضاد امور کے یکجا ہونے کی صورت نہیں؟ کیا اس طرح دو متناقض چیزوں کا اکٹھا ہونا لازم نہیں آتا کہ جسے علمی زبان میں اجتماع متناقضین کہتے ہیں جو کہ محال ہے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کا توہم اور بے بنیاد تصور وخیال تعلیمات الٰہیہ کی اعلیٰ ترین حکمتوں اور معارف قرآنیہ کے اسرار ورموز سے جہالت و ناآگاہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اسلام کے تمام احکام وتعلیمات اور فرامین ودستورات (شریعت اسلامیہ) کی اصل واساس تکوینیات وفطریات پر استوار ہے اور انسانی وجود کے طبعی تقاضوں کی تکمیل اس کا ہدف و مقصد اعلیٰ ہے جیسا کہ اس حوالہ سے ہم بارہا اپنی اس کتاب کے مختلف موضوعات کی بحثوں کے ذیل میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں خداوند عالم نے واضح وصریح الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ روم آیت: ۳۰

○ "فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ"

(خلوص وحسن نیت کے ساتھ دین کو اپنا لو کہ وہی حقیقی معنی میں فطرت الٰہی ہے کہ جس کی بنیاد پر اس نے لوگوں کو خلق فرمایا ہے، خدا کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی اور یہی مضبوط دین وآئین حیات ہے)

ان مطالب سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ حقیقی تکوینی اسباب نوع انسانی کو وجود عطا کرنے کے لئے باہمی تعاون و مدد کے ساتھ اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور ان اسباب کی اثر گزاری کا سلسلہ ہی ایسا ہے کہ جو انسان کو اس کے اس وجودی مقصد

کی طرف لے جاتا ہے تو اب خود انسان پر واجب ولازم ہے کہ ان اسباب کی اثر گزاری کو نتیجہ بخش بنانے کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے ایسی راہ وروش اور طرز عمل اختیار کرے جس سے ان اسباب سے مکمل ہم آہنگی پیدا ہو اور ان کی اثر گزاری بے نتیجہ ثابت نہ ہو اور نہ ہی اس کے طرز عمل اور ان اسباب کے درمیان تناقض وتضاد لازم آئے کیونکہ اگر ایسا ہوا یعنی اس کے طرز عمل اور اسباب کے درمیان تضاد وتناقض اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو اس کا نتیجہ خود اس کی تباہی وہلاکت اور شقاوت وبدبختی کے سوا کچھ نہ ہوگا تو یہ بات (اگر مذکورہ بالا تصورات وخیالات کا حامل شخص فکر وفہم سے کام لے) بعینہ دین اسلام ہے (اسلامی تعلیمات کا محور واساس اور حقیقی روح یہی ہے)، اور چونکہ ان اسباب سے بالاتر اور مافوق ایک ایسا سبب موجود ہے جو ان اسباب کو وجود میں لانے والا ہے اور اسی نے ان اسباب کو اسباب ہونے کی حیثیت عطا کی ہے لہذا انسان پر لازم وضروری ہے کہ اس مسبب الاسباب (اسباب کو اسباب بنانے والے) کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور حقیقی معنی میں اس کی اطاعت کا عملی دم بھرے، توحید کو دین اسلام کی اصل واساس قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے، انہی مطالب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلمہ توحید سے عملی وابستگی اور خدائے یکتا کی کامل بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے زندگی کے سفر میں صرف اس کی رضا وخوشنودی کے حصول کی خالصانہ کوشش ہی حقیقت میں اسباب سے پورے طور پر ہم آہنگ ہونے کا دوسرا نام ہے اور ان اسباب میں سے ہر سبب کا پورا پورا حق ادا کرنا کہ جس میں کسی قسم کا شرک وغفلت نہ پائی جائے وہی اصل اسلام وروح توحید ہے، اس بناء پر ہر مسلمان کی زندگی میں دو اغراض ملحوظ ومتعین ہوتی ہیں۔ ایک دنیاوی اور دوسری اخروی۔ اسی طرح دو مقاصد پائے جاتے ہیں۔ ایک مادی اور دوسرا معنوی وروحانی، لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کی بابت ضرورت سے زیادہ توجہ واہتمام نہیں کرتا یعنی جس قدر ان دونوں کے تقاضے پورے کرنے چاہئیں وہ ان سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کا اس کی حدود میں رہتے ہوئے خیال واہتمام کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اللہ کی وحدانیت کی عملی پاسداری کی دعوت دیتے ہوئے صرف اسی سے وابستہ رہنے اور اس کے ساتھ خالص پیوستگی کو یقینی بنانے کا حکم دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے علاوہ ہر سبب سے روگردانی کرنے کی تاکید کرتے ہوئے غیر اللہ کو مقصد ومقصود قرار دینے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے البتہ اس سب کے باوجود لوگوں کو زندگی کے ظاہری اسباب سے بھر پور استفادہ کرنے اور روزمرہ کے معمولات میں طبیعی وسائل ونظام کے مطابق راہ وروش اپنانے کا حکم دیتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جو کہ مسبب الاسباب اور ہر سبب سے مافوق ہے اس سے وابستہ وپیوستہ رہتے ہوئے دیگر ظاہری اسباب سے بھر پور استفادہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے افراد ہی حقیقی معنی میں دنیا وآخرت کی سعادت سے بہرہ ور ہیں اور ان کے تمام اعمال میں ان کا مقصد اعلیٰ خدائے واحد کی رضا وخوشنودی کا حصول ہے جو کہ زندگی کی دیگر اغراض سے ہرگز متصادم نہیں ہوتا خواہ وہ اغراض جس قدر بھی ہوں اور ان کی اثر گزاری کا دائرہ جس قدر وسیع کیوں نہ ہو۔

اس بیان سے ایک اور غلط فہمی اور توہم کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ علم الاجتماع کے کچھ ماہرین جس کا شکار ہوئے اور کہتے

ہیں کہ دین کی حقیقت اور اصل غرض وغایت معاشرتی عدل کا قیام ہے اور عبادات اس کی فرع ہیں اور جو شخص ان فروعات پر عمل پیرا ہو وہی دیندار کہلائے گا خواہ اس پر اعتقاد رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور خواہ خدا کی بندگی کا عقیدہ دل میں ہو یا نہ ہو، (یعنی ظاہری طور پر نماز و روزہ وغیرہ کا پابند ہو لیکن دل میں ان کی حقیقت اور حقانیت اور ادائے بندگی، خدا کا عقیدہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)۔ اس تصور و توہم اور واضح غلط فہمی و غلطی کے بارے میں کسی بحث کا بغور مطالعہ و تحقیق کرنے والا کوئی بھی شخص اس نظریہ کے بطلان و نادرستی کی بابت کسی اضافی بحث و استدلال سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس نظریہ کے غلط ہونے کا اعتراف و اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ اس نظریہ میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں عقیدۂ توحید سے دستبرداری اور پاکیزہ اخلاقی کمالات و فضائل کو دینی اقدار و اصولوں کی فہرست سے خارج کر دینا شامل ہے کہ جس کے نتیجہ میں دین کی اصل غرض وغایت جو کہ کلمۂ توحید ہے اسے دنیا کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونے میں تبدیل کر دینا لازم آتا ہے جبکہ یہ دو اغراض ایک دوسری سے قطعی طور پر مختلف ہیں اور ان میں کوئی ایک، دوسری سے کسی بھی حوالہ و جہت میں یک رنگ و یکجا نہیں ہو سکتیں نہ اپنے اصولوں میں اور نہ اپنے فروعات و نتائج و آثار میں، کسی بھی نسبت سے ان کے درمیان مقصدی ربط نہیں پایا جاتا، مقصدیت کے تناظر میں نہ تو کلمۂ توحید کی بازگشت، معاشرتی تمدن کی طرف ہوتی ہے اور نہ ہی معاشرتی تمدن کی بازگشت کلمۂ توحید کی طرف ہوتی ہے (گویا دونوں کی سمت مختلف ہے)۔

۹۔ اسلام میں آزادی کا معنی و مفہوم؟

''آزادی'' کا جو معنی لوگوں کے ذہنوں میں پایا جاتا ہے اس کی تاریخ چند صدیوں سے زیادہ نہیں اور اس کے زبان زد عام ہونے کی عمر غیر معمولی مدت کی حامل نہیں، شاید اس کا اصل سبب اور اس کے موجودہ صورت میں سامنے آنے کی بنیادی وجہ یورپ کی تمدنی تحریک ہے جو چند صدیاں پہلے شروع ہوئی لیکن اس کا معنی قدیم زمانوں ہی سے ذہنوں میں راسخ اور دلوں کی تمناؤں میں سے ایک تھا۔

جہاں تک ''آزادی'' کی اصل حقیقت کا تعلق ہے تو اس کی کڑیاں ولڑیاں طبع الوجود اور تکوین و تخلیق سے ملتی ہیں اور اس کا رشتہ ناطہ انسانی وجود میں پائی جانے والی اس قوت سے ملتا ہے جو اسے عمل کی راہ پر لانے میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں جو قوت ودیعت فرمائی ہے کہ جسے ''ارادہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے وہ آزادی کا سرچشمہ ہے اور اسی سے اس کی اصل و اساس اور معنی و مفہوم کی مظہریت وابستہ ہے اور وہ ایسی باطنی حالت ہے کہ اس پر انسانیت کی بقاء موقوف ہے اور اس کے بے اثر ہونے سے احساس و شعور کی وہ قوتیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں جن کے بے اثر و بیکار ہو جانے سے اصل انسانیت بے اثر و بے نتیجہ اور بیکار ہو سکتی ہے اور چونکہ انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے کہ اس کی طبع

وجودی اجتماعی زندگی کی متقاضی ہوتی ہے اور اسے دیگر ہمنوع افراد کے ساتھ مل کر زندگی گزارنے کی راہ پر لاتی ہے لہٰذا اس کا ارادہ دیگر افراد بشر کے ارادوں اور اس کا کام دیگر ہمنوع افراد کے کاموں میں پیوست ہو جاتا ہے اور پھر اسے اس قانون کی عملی پاسداری کا ثبوت دینا پڑتا ہے جو ارادوں اور اعمال کو مقررہ حدوں میں رکھتے ہوئے اعتدال کی راہ پر لاتا ہے، بنابرایں وہ طبع وجودی جو انسان کو ارادہ وعمل میں آزادی عطا کرتی ہے بعینہٖ وہی ارادہ وعمل کی حدود متعین کرتی ہے اور پہلے دی ہوئی آزادی کو مقید کر دیتی ہے۔

اور جہاں تک عصر حاضر کے مروجہ قوانین (جو کہ اہل یورپ کے وضع کردہ ہیں) کا تعلق ہے تو چونکہ ان کی تدوین ہی مادی استفادہ کی بنیاد پر ہوئی جیسا کہ آپ آگاہ ہیں لہٰذا ان میں اصل دینی امور کی بابت کھلی آزادی دی گئی کہ ان کے بارے میں ہر شخص آزاد ہے خواہ انہیں اپنائے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرے یا نہ اپنائے اور انہیں ترک کرے، یہی حالت اخلاقیات کے بارے میں ہے بلکہ اس سے بالاتر یہ کہ ان قوانین سے ماوراء جو کچھ بھی انسان چاہے اور عمل کرے اس میں اسے پوری آزادی حاصل ہے، تو یہ ہے ان کے نزدیک آزادی کا معنی!

لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے اپنے قوانین سب سے پہلے توحید کی بنیاد پر وضع کئے جیسا کہ آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں، گویا توحید اسلامی قوانین کی پہلی بنیاد ہے، پھر اس کے بعد پاکیزہ اخلاق کو دوسری بنیاد قرار دیا گیا ......گویا پاکیزہ اخلاق توحید کی بنیاد پر استوار ہیں...... پھر ہر چھوٹے بڑے عمل...... خواہ فردی وشخصی ہو یا اجتماعی وعمومی...... اور جس کا تعلق کسی بھی حوالہ سے انسان کی زندگی سے ہو اس کے بارے میں شریعت اسلامیہ میں ٹھوس احکام موجود ہیں اور ان کی بابت مذکورہ بالا معنی کی حامل آزادی ہرگز تصور نہیں ہو سکتی، البتہ اس میں انسان کو غیر اللہ کی بندگی کے بندھن سے آزادی دلائی گئی ہے اور وہ ایک ہی لفظ ہے یعنی آزادی لیکن اس کا معنی بہت وسیع ہے اور اس کی وسعت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو اسلامی آداب زندگی اور اس عملی سیرت کے اصولوں کی چھان بین کر کے ان کی باریکیوں سے مطلع ہو کہ جن آداب وسیرت کے اپنانے کی دعوت اسلام نے لوگوں کو دی اور معاشرے میں ان کی عملی پاسداری کو یقینی بنانے کی تاکید کی اور پھر ان آداب واسلامی سیرت کا عصر حاضر کے ان آداب وسیرت سے موازنہ کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اہل مغرب کے وضع کردہ قوانین میں ملحوظ ہیں اور وہ ہر معاشرے کے قوی وضعیف شخص پر زبردستی لاگو کرنے کے درپے رہتے ہیں، جو شخص یہ موازنہ کر سکتا ہو وہ بخوبی آگاہ ہو جائے گا کہ اسلامی اصولوں اور مغربی قوانین کے درمیان آزادی کے حوالہ سے کیا فرق پایا جاتا ہے؟ اور اسلام نے جو احکامات صادر فرمائے ہیں ان میں پاکیزہ رزق سے پوری طرح استفادہ کرنے کی بھرپور آزادی کے ساتھ ساتھ افراط وتفریط سے پاک معتدل زندگی بسر کرنے کی تاکید کی گئی، چنانچہ ارشاد الٰہی ہوا:

سورۂ اعراف، آیت: ۳۲

○ ''قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ......''

(کہہ دیجئے کہ کس نے اس خدائی زینت کو حرام کیا جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے قرار دی، اور پاکیزہ رزق کو)

سورۂ بقرہ، آیت: ۲۹

○ "خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا"

(اس نے روئے زمین پر موجود سب کچھ تمہارے لئے پیدا کیا)

سورۂ جاثیہ، آیت: ۱۳

○ "وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ"

(اوراس نے آسمانوں اور زمین میں موجود سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

آزادی کی بحث میں بعض محققین ومفسرین نے اسلام میں عقیدہ کی آزادی کے اثبات میں اپنے آپ کو زحمت میں ڈالتے ہوئے بعض قرآنی آیات سے دلیل پیش کرنے کی بیجا کوشش کی، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت مبارکہ ۲۵۶ "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" (دین میں جبر نہیں) اوراس سے مشابہ دیگر آیات سے استدلال کرتے ہوئے آزادیٔ عقیدہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، جبکہ سابقہ تفسیری بحث میں اس آیت مبارکہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے اور یہاں اضافہ کے ساتھ ہم بیان کرتے ہیں کہ آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ تمام اسلامی احکامات کی اصل واساس توحید ہے تو اس کے باوجود یہ کیونکر قابل تصور ہے کہ عقیدہ میں آزادی دی جائے؟ تو کیا اس سے واضح تناقض اور صریح تضاد لازم نہیں آتا؟ یعنی جب تمام احکام خدا کی وحدانیت اور یکتائی کے عقیدہ پر استوار ہیں تو پھر عقیدہ میں آزادی کا کیا معنی؟ عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ عقیدہ میں آزادی اس طرح ہو جائے گی جیسے یوں کہا جائے کہ اہل مغرب کے مقررہ قوانین میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے، یہ بات صریح تضاد ہے کیونکہ اس طرح قوانین کی تدوین وتشکیل کی غرض ومقصود حاصل ہی نہیں ہوگا اور قانون سازی بے نتیجہ ہو جائے گی اوراس سے قانون کی حاکمیت باقی نہ رہے گی،

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ عقیدہ سے مراد کسی امر پر قلبی یقین ہے جو انسان کی لوح ذہن پر ثبت ونقش ہو جاتا ہے اور وہ انسان کا ایسا عمل نہیں جس میں کرنا و نہ کرنا یا آزادی و پابندی کی گنجائش پائی جائے، بلکہ کرنے یا نہ کرنے کی بات تو اس کے لوازم و بنیادی تقاضوں سے تعلق رکھتی ہے یعنی اعمال کی انجام دہی یا ترک عقیدہ کی بنیاد پر ہوتا ہے اور عقیدہ جس کام کے کرنے کا متقاضی ہو وہ کیا جاتا ہے اور جسے ترک کرنے کا متقاضی ہو اسے ترک کیا جاتا ہے، گویا انجام یا ترک کا لازمی ہونا عقیدہ نہیں بلکہ عقیدہ کے تقاضوں میں شامل ہے مثلاً دوسروں کو اس عقیدہ کے اپنانے کی دعوت دینا اور اس کے بارے میں انہیں بھرپور دلائل کے ساتھ قائل کرنا اور تحریر وتقریر کے ذریعے اس کی تبلیغ کرنا اور اس

کے ساتھ ساتھ ان عقائد واعمال کے غلط ونادرست ہونے کو ثابت کرنا جو اس سے منافی ہوں اور لوگوں میں رائج وعام ہوں وغیرہ سب کچھ عقیدہ کے لازمی تقاضوں میں سے ہے۔ تو ایسے امور میں منع وجواز کی گنجائش پائی جاتی ہے، بنابرایں یہ واضح ہے کہ اگر معاشرے میں مروجہ قوانین یا جس چیز پر وہ قوانین مبنی ہوں اس کے منافی ہوں تو قانون اس کی ممانعت کرے گا اور ان تقاضوں پر عمل نہیں کرنے دے گا جبکہ اسلام نے اپنے قوانین کی بنیاد صرف توحید (توحید، نبوت، قیامت) کو قرار دیا ہے اور اسی پر اپنے تمام احکامات وضع کئے اور اسی پر تمام اہل اسلام اور دیگر اہل کتاب یعنی یہود، نصاریٰ اور مجوس سب متفق ومجتمع ہیں، ان تین اصولوں ہی میں حریت وآزادی پائی جاتی ہے ان کے علاوہ کسی بھی نظام وآئین میں حقیقی آزادی نہیں ملتی بلکہ دین کی اصل واساس ہی منہدم ہوجاتی ہے اور ایسے اصول وضع کئے گئے ہیں جن میں دین کا نام ونشان ہی باقی نہیں رہتا، البتہ اس موضوع میں آزادی کی ایک قسم ''اظہار عقیدہ'' بھی ملحوظ ہے تو اس کی بابت فصل ۱۳ میں عنقریب تذکرہ کیا جائے گا۔

(۱۰) اسلامی معاشرہ میں تحول وتکامل کے طریقے؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اسلامی نظام وآئین، زندگی کا جامع دستور العمل ہے کہ جس میں زندگی کو سعادتمندی سے ہمکنار کرنے کے تمام اصول موجود ہیں اور اسلامی معاشرہ حقیقی معنی میں سعادتمند معاشرہ ہے کہ جس پر دیگر معاشرے رشک کرتے ہیں لیکن اس کے جامع دستور العمل ہونے کے باوجود اس میں آزادئ عقیدہ کے فقدان کی وجہ سے اس کی ترقی کے راستے بند ہیں اور اس کا سفر کمال آگے نہیں بڑھتا اور یہ بات کسی کامل معاشرہ کے لئے بہت بڑا نقص وعیب اور خامی شمار ہوتی ہے کیونکہ کسی چیز کا ترقی وکمال کی جانب بڑھنا اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس میں ایک دوسرے سے متضاد قوتیں پائی جائیں اور وہ سب فعال بھی ہوں تاکہ ان کی ٹوٹ پھوٹ سے ایک ایسا مولود وجود میں آئے جو ان تمام خامیوں سے مبرا ہو جو متضاد قوتوں کی عملداری سے پیدا ہونے والی صورتحال کے نتیجہ میں وجود میں آئیں اور پھر زوال پذیر ہوگئیں، بنابرایں بالفرض اسلام کے بارے میں یہ نظریہ رکھیں کہ وہ اضداد ونواقص اور بالخصوص متضاد عقائد کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے تو اس سے یہ بات ماننی پڑے گی کہ وہ معاشرہ جسے خود اسلام نے تشکیل دیا وہ ترقی وتکامل سے محرومی کی راہ پر چل پڑے اور اس کی پیشرفت کا سلسلہ رک جائے۔

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں اس مادی نظریہ والوں کی ہیں جو مادہ (Matter) کے تحول وتکامل کے قائل ہیں یعنی میٹریالیسزم ڈایالیکٹک، کہ جن میں عجیب وغریب خلط ملط پایا جاتا ہے۔

کیونکہ انسانی عقائد ومعارف کی دو قسمیں ہیں:

(۱) جو تحول وتکامل کو قبول کرتی ہے، اس میں وہ علوم وفنون شامل ہیں جو مادی زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور طبع انسانی میں پائی جانے والی عصیان پسند قوت کو مات دینے کے لئے بنائے گئے ہیں مثلاً علم ریاضیات وعلم طبیعیات وغیرہ، تو

اس طرح کے علوم وفنون سب ہی ایسے ہیں کہ وہ جوں ہی نقص سے کمال کی طرف بڑھتے ہیں تو اجتماعی ومعاشرتی زندگی کی تبدیلی اور ترقی وتکامل کی راہیں کھل جاتی ہیں اور پھر زندگی ایک نیا رخ اختیار کرلیتی ہے۔

(۲) تبدیلی وتکامل کی کسی بھی صورت کو قبول نہیں کرتی البتہ دوسرے معنی میں تبدیلی وتکامل کو قبول کرتی ہے، اس میں وہ عمومی علوم ومعارف الٰہیہ شامل ہیں جن میں مبداء و معاد اور سعادت وشقاوت وغیرہ کی بابت حتمی ویقینی اور نا قابل تغیر و تبدل اصول پائے جاتے ہیں اگر چہ ان کے بارے میں باریک بینی سے کام لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ترقی وتکامل کی گنجائش موجود ہے، یہ علوم ومعارف معاشرتی زندگی میں کلی وجامع صورت میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں لہٰذا ان معارف وآراء کا ایک ہی حالت وکیفیت میں باقی رہنا معاشروں کی ترقی کے سفر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا چنانچہ اس کا واضح ثبوت ہم اپنی عملی زندگی میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ اس طرح کہ ہم اپنے اندر ایسے کثیر نظریات وآراء رکھتے ہیں جو ایک ہی حالت میں باقی ہیں اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشرے کی ترقی کا سفر ہرگز نہیں رکتا مثلاً ہم قائل ہیں کہ انسان پر لازم وضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے کام کرے اور وہ کام ایسا ہو جس کا فائدہ انسان کو حاصل ہو، اور ضروری ہے کہ انسان معاشرتی زندگی کو اپنائے، اور ہم قائل ہیں کہ یہ کائنات حقیقی وجود رکھتی ہے نہ کہ وہمی وخیالی! اور یہ کہ انسان اسی عالم کا حصہ ہے اور انسان عالم ارضی کا حصہ اور انسان کے وجود میں اعضاء وجوارح اور گوں ناگوں قوتیں پائی جاتی ہیں، تو یہ وہ آراء ونظریات ہیں جو قائم وثابت اور نا قابل تبدیلی ہیں اور ان کا نا قابل تبدیلی ہونا معاشروں کی ترقی وتکامل کے سفر کے رک جانے کا سبب ہرگز نہیں ہوسکتا، انہی نظریات وعقائد اور آراء میں سے ایک یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے جس نے لوگوں کی سعادتمند زندگی کے لئے جامع دستور العمل وضع کیا ہے اور سلسلہ نبوت قائم کرکے اپنے بندوں کو سعادتمندی کے حصول کی راہ دکھائی ہے، اور ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ خدائے یکتا تمام لوگوں کو ایک دن اکٹھا کرے گا جس میں انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ وجزاء دے گا، تو اسی بات پر اسلام نے اپنے معاشرتی نظام کو قائم و استوار کیا ہے اور اسی میں معاشرہ کی بقاء وتحفظ کا راز پوشیدہ ہے، اور یہ واضح ومعلوم ہے کہ اگر اس نظریہ وعقیدہ میں کسی قسم کی لچک اور ثبوت ونفی اور نئی رائے پیدا ہونے کی گنجائش موجود ہو تو اس سے معاشرہ کی تباہی کے سوا کچھ نتیجہ حاصل نہ ہوگا چنانچہ یہ مطلب کئی بار ذکر ہو چکا ہے اور یہ حال تمام برحق مطالب ومعارف اور حقائق کا ہے جن کا تعلق ماوراء الطبیعہ سے ہے لہٰذا ان کا انکار خواہ کسی بھی وجہ وبنیاد پر ہو اس سے معاشرہ کو زوال وپستی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوسکے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انسانی معاشرہ کو اپنے ارتقائی سفر میں روز بہ روز تبدیلی وتکامل کی ضرورت ہے جس میں عالم طبیعت اور جہان مادہ کے وسائل واسباب سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے ترقی کی منزل پائی جاسکے اور ایسا ہونا مسلسل کاوش وجدوجہد اور تحقیق وبحث کے ذریعے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے ہی پر موقوف ہے اور اسلام اس سے ہرگز منع نہیں کرتا۔

اور جہاں تک معاشروں کے نظام ہائے امور میں تبدیلی کا مسئلہ ہے کہ ان میں آئے دن نئے نظام ہائے حکومت سامنے آتے ہیں مثلاً کبھی بادشاہت کا استبدادی نظام تو کبھی جمہوریت اور کبھی کمیونزم اور کبھی کچھ اور، تو یہ سب تبدیلیاں ان نظاموں میں پائی جانے والی خامیوں اور نواقص کے حوالہ سے ہوتی ہیں اور افراد بشر عملی طور پر آگاہ ہو جاتے ہیں کہ ان نظاموں میں انسانی معاشرہ کو مطلوبہ کمال تک پہنچانے اور اس کی حقیقی و بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی لہٰذا ان میں تبدیلی کا جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے اور پھر ایک نظام کو چھوڑ کر دوسرے نظام کو اپنایا جاتا ہے لیکن یہ تبدیلی ان نظاموں کے ناقص و کامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ صحیح و غلط ہونے کی بناء پر ہوتی ہے (جبکہ عین ممکن ہے کہ وہ سب ہی غلط ہوں)۔ بنابراین اگر معاشرتی راہ و روش اور طرز زندگی، فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق استوار ہو یعنی معاشرتی عدل و انصاف، اور افراد معاشرہ اچھی تربیت کے سایہ میں مفید علم اور نیک عمل سے آراستہ ہو جائیں اور پھر خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہوئے علم و عمل میں ترقی کے مراحل طے کر کے اپنی سعادت کی راہ پالیں اور روز بروز ترقی و تکامل میں اضافہ و وسعت سے مالا مال ہو رہے ہوں تو اس سے بڑھ کر انہیں معاشرتی طرز زندگی و نظام حیات کیا چاہیے ہوگا اور وہ کسی تبدیلی و انقلاب کے درپے کیوں ہوں گے؟ اس بناء پر یہ حقیقت واضح و آشکار ہوتی ہے کہ کوئی عاقل و دانشمند ہرگز یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسان کے لئے ہر صورت اور ہر حال میں تبدیلی ضروری ہے خواہ وہ اس تبدیلی کی احتیاج نہ بھی رکھتا ہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ مذکورہ بالا تمام امور میں تغیر و تبدل ممکن ہے اور یہ درست نہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مثلاً اعتقادات، اصول اخلاقیات وغیرہ، جبکہ ان سب میں تبدیلی معاشرتی حالات اور علاقائی تقاضوں کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر ہو جاتی ہے لہٰذا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جدید دور کے انسان کا طرز تفکر، قدیم دور کے انسان کے طرز تفکر سے مختلف ہے، اسی طرح علاقائی طرز زندگی کے فرق کی وجہ سے افراد کے افکار و آراء اور نظریات میں فرق پایا جاتا ہے مثلاً خطہ ارضی کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کے طرز تفکر اور راہ و روش یکساں نہیں، اسی طرح خادم و مخدوم، دیہاتی و شہری، مالدار و نادار، فقیر و غنی، اور اس طرح کے دیگر معاشرتی طبقات کے طرز زندگی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، تو عوامل و اسباب کے مختلف ہونے سے افکار و آراء میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور زمانوں کی تبدیلی سے ان میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور نظریات و عقائد خواہ جس قدر پختہ ہوں وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی آنا ممکن بلکہ ناگزیر ہوتا ہے۔

اس سوال یا اعتراض کے جواب میں ہم عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کی باتیں کرنا ایک صریح غلط فہمی کی بناء پر ہے اور

وہ یہ کہ انسانی علوم و آراء اور ان کے لوازم و متعلقات کا صحیح و غلط اور خیر و شر ہونا کسی قاعدہ کلیہ پر مبنی نہیں بلکہ نسبت واضافت کی بنیاد پر ہے، بنابرایں مبداء و معاد سے تعلق رکھنے والے کلی معارف و نظریات اور اسی طرح کے عملی کلی نظریات مثلاً یہ کہ معاشرتی زندگی انسان کے لئے خیر و بہتر ہے اور یہ کہ عدل خیر ہے (یہ کلی احکام ہیں اس میں ان کے کسی مورد پر منطبق ہونے کا حوالہ ملحوظ نہیں) تو یہ احکام نسبت کے حوالہ سے بدلتے رہتے ہیں اور زمانوں، حالات و واقعات کی بناء پر ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔

اس نظریہ کے غلط ہونے کو ہم اس کی متعلقہ بحث میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں اور اس کی کلیت کے نادرست ہونے کو ثابت کر چکے ہیں اور اس حقیقت کو آشکار کر چکے ہیں کہ اس طرح کا عقیدہ و نظریہ قطعی طور پر غلط ہے، وہاں بیان کردہ مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر میں تمام کلی نظری امور اور بعض کلی عملی آراء شامل نہیں یعنی اس کا دائرہ اس قدر وسیع نہیں کہ تمام نظری امور اور عملی آراء پر بھی اس کا اطلاق ہو سکے، اور اس کے کلی ہونے کی نفی کے لئے اس قدر کافی ہے کہ اگر اس نظریہ کے کلی و عام اور جامع ہونے کو درست مان لیا جائے تو اس سے خود اسی کے مطلق ہونے کا اثبات ہوگا جو کہ ہمارا مطلوب ہے (یعنی نسبت سے خالی ہونا)۔ اور اگر اسے مطلق کلیت کا حامل نہ مانا جائے بلکہ قضیہ جزئیہ تسلیم کیا جائے تو اس سے ایک قاعدہ کلیہ...... قضیۂ کلیۂ مطلق...... کا اثبات ہوگا، لہٰذا ہر صورت میں اس نظریہ کی کلیت باطل ہو جاتی ہے، اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہو کہ "ہر رائے و نظریہ کا کسی نہ کسی دن تبدیل ہونا ضروری ہے" تو خود اس نظریہ کا کسی دن تبدیل ہونا بھی ضروری ہوگا اور اس میں تبدیلی لا کر یوں کہنا پڑے گا کہ "بعض آراء و نظریات میں ہرگز تبدیلی نہیں آنی چاہیے" تو اس سے ثابت ہوا کہ مذکورہ نظریہ کلیت نہیں رکھتا، (غور کریں)

(۱۱) آیا اسلامی احکامات انسان کو سعادت مند بنا سکتے ہیں؟

ممکن ہے کہا جائے کہ اسلامی احکام نزول قرآن کے زمانے میں موجود تمام افراد بشر کے لئے جامع و مکمل ضابطۂ حیات کی صورت میں تھے کہ جن سے اس دور کے انسانی معاشرہ کو اس کی سعادت سے ہمکنار کرنا اور تمام افراد کی آرزوہائے زندگی کی تکمیل ممکن تھی اور وہ اس مقصد کے لئے کافی و وافی تھا، لیکن رفتار زمانہ اور گردش روزگار نے انسانی زندگی کے طور طریقوں کو یکسر بدل دیا لہٰذا تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت موجودہ دور میں جس صورت میں ہے اس کی نظیر چودہ سو سال پہلے کی سادہ زندگی سے کوئی مشابہت و مماثلت نہیں رکھتی کیونکہ اس دور کی زندگی نہایت معمولی ابتدائی طبیعی وسائل سے استفادہ کرنے تک محدود تھی جبکہ انسان نہایت وسیع جدوجہد اور دشوار ترین مراحل طے کرنے کے بعد ترقی و تکامل اور معاشرتی ارتقاء کے اس بلند درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ اگر اس کا موازنہ صدیوں پہلے انسان کی زندگی و حالات سے کیا جائے تو ایسا لگے گا جیسے دو متضاد قسم کی مخلوق کے درمیان موازنہ کیا جا رہا ہے، تو اس صورتحال میں کس طرح ممکن ہے کہ جو قوانین اس دور کے

لوگوں کی زندگی کے لیے وضع کیے گئے اور اس دور کے تقاضوں کے مطابق ان کی تدوین وتشکیل عمل میں لائی گئی وہ موجودہ دور کے افراد و بشر کی نہایت اعلیٰ زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں؟ اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان دو مختلف طرز کی حامل زندگیوں میں سے ہر ایک، دوسری کا بوجھ اٹھا سکے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں زمانوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اس کا تعلق طرز زندگی سے ہے نہ کہ بنیادی امور سے! گویا وہ مصداق اور مورد کا فرق ہے اصل و اساس کا نہیں، اس مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں غذا کا محتاج ہے کہ جس سے اپنا پیٹ بھر سکے، لباس کا محتاج ہے جس سے اپنا بدن ڈھانپ سکے، مکان کا محتاج ہے جس میں سکونت پذیر ہو سکے، وسائل و اسباب کا محتاج ہے جن سے اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو یقینی بنا سکے، معاشرہ کا محتاج ہے کہ جس میں اپنے ہمنوع افراد کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر سکے، زندگی کے ازدواجی، تجارتی، صنعتی، عملی اور دیگر امور کی تکمیل کے لئے متعلقہ و مربوطہ وسائل و روابط کا محتاج ہے، تو یہ تمام ضروریات و حاجات ایسی بنیادی چیزیں ہیں جو ہمیشہ ایک ہی صورت کی حامل ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی اور جب تک انسان انسانیت کی صفت سے متصف ہوتا ہے اس میں اس فطرت اور تخلیق کے بنیادی تقاضے یکساں باقی ہوتے ہیں کیونکہ ان سب کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، لہٰذا اس حوالہ سے پہلے دور کا انسان اور موجودہ دور کا انسان برابر ہیں دونوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اگر ان دونوں انسانوں میں کوئی فرق و اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ ان وسائل و اسباب کے حوالہ سے ہے جن سے استفادہ کرتے ہوئے انسان اپنی مادی زندگی کے امور کی تکمیل اور حالات کی پیداوار ضرورتوں و تقاضوں کو پورا کرتا ہے، مثلاً پہلے دور کا انسان اپنی غذا میں میوے و پھل، سبزی جات اور شکار کیا ہوا گوشت نہایت سادہ طریقہ سے استعمال کر کے زندگی گزارتا تھا جبکہ آج اس کی گوں ناگوں کھانے پینے کی مختلف ذائقوں کی حامل اشیاء موجود ہیں جن کے استعمال سے اس کی طبع وجودی لذت اٹھاتی ہے، اور اس طرح مختلف رنگ ہیں جن کے مشاہدہ سے اس کی قوت بصارت لطف اندوز ہوتی ہے، اور خوش ذائقہ چیزیں ہیں جن سے وہ مزے لیتا ہے اور ایسی عمدہ کیفیات ہیں جن سے اس کی زندگی نہایت دلچسپ ہو چکی ہے، اسی طرح لاتعداد ایسے امور و احوال ہیں جو موجودہ دور کے انسان کی زندگی میں یکسر تبدیلی کا سبب بنے ہیں، لیکن اس تمام واضح اختلاف و فرق کے باوجود دوسرا انسان پہلے انسان سے اس بات میں یکساں ہے کہ یہ سب کچھ ایسی بنیادی ضرورتوں سے عبارت ہو جو انسان کو انسان ہونے کی حیثیت میں ناگزیر ہیں اور ایسی غذا ہو جو انسان کو بھوک پیاس اور دیگر شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ضروری و لازمی ہے، اس بناء پر جو کلی اعتقادات پہلے دور کے انسان کے تھے وہ زمانہ کی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوئے اور ایک دور سے دوسرے دور کے انسان کی فطری ضرورتوں میں فرق نہیں آیا بلکہ بعینہٖ یکساں رہے اور پہلے اور دوسرے دور کے انسان کی بنیادی زندگی کے تقاضوں میں کوئی فرق نہیں آیا، اسی طرح وہ کلی و جامع قوانین و احکام جو اسلام میں وضع و مقرر کیے گئے ہیں وہ انسانی فطرت کے عین مطابق اور اس کی سعادت کے تمام تقاضوں کی تکمیل کے

ضامن ہیں ان میں وسائل کی تبدیلی اصل فطرت میں تبدیلی وانحراف نہ آنے کی شرط کے ساتھ ان احکام وقوانین کو تبدیل نہیں کرسکتی لیکن اگر اصل فطرت ہی بدل جائے تو پھر اسلامی اقدار واحکام اس سے ہرگز ہم رنگ نہیں ہوسکتے اور اس میں قدیم و جدید دونوں زمانے برابر ہیں۔

اور وہ جزئی احکام جو حالات کے نتیجہ میں رونما ہونے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت جلد تغیر وتبدل کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً مالیات، دفاع، باہمی رابطوں کی آسانی، ذرائع ابلاغ وارتباط اور شہری زندگی کے امور سے تعلق رکھنے والے احکامات وغیرہ تو وہ سب حاکم اور سربراہ مملکت کے فیصلوں اور تشخیص پر موقوف ہوتے ہیں، وہی ان کی بابت موزوں ومناسب اقدامات کرتا ہے کیونکہ حاکم وسربراہ مملکت کا مقام ومرتبہ اپنے دائرہ اقتدار میں اسی طرح ہوتا ہے جیسے کسی گھر میں گھر والے شخص کا! حاکم وسربراہ مملکت کو اسی طرح اختیار حاصل ہوتا ہے جیسے گھر والے کو اپنے گھر کے بارے میں فیصلے واقدامات کرنے کا اختیار حاصل ہے کہ جو فیصلہ کرے اور حکم جاری کرے اور گھر میں جس طرح کا نظم ونظام مقرر کرے اور جس طرح کی ترتیب امور دے یہ سب اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح حاکم وسربراہ مملکت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ معاشرہ کے داخلی وخارجی امور کی بابت اقدام کرے اور جنگ وصلح اور مالی وغیر مالی تمام امور میں بنیادی فیصلے کرے کہ جن میں معاشرہ کی بہتری کی ضمانت پائی جاتی ہو البتہ یہ سب کچھ اہل اسلام سے مشورہ ومشاورت کے بعد ہو جیسا کہ اس سلسلہ میں واضح ارشاد الٰہی ہے:

○ "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ"

(اور لوگوں سے مشورہ کرو، پس جب فیصلہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو)...... سورۂ آل عمران آیت: ۱۵۹

اس حکم کا تعلق زندگی کے عمومی مسائل سے ہے۔ یہ احکام اور جزئی اقدامات وفیصلے معاشرہ کی مصلحتوں اور اسباب کی تبدیلی کے باعث تبدیل ہوتے رہتے ہیں کیونکہ اسباب اور معاشرتی مصلحتوں میں ہمیشہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جبکہ وہ احکام خداوندی جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں ان میں اس طرح کی تبدیلیاں نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کے منسوخ ہونے کی ضرورت پڑتی ہے، احکام خداوندی میں نسخ کی تفصیلی بحث دوسرے مقام پر ہوگی۔

(۱۲) اسلامی معاشرہ میں حاکم کا معیار اور سیرت؟

صدر اسلام میں معاشرہ کی باگ ڈور اور حاکمیت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہے، خداوند عالم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت وپیروی تمام لوگوں پر واجب ولازم قرار دی اور آنحضرتؐ کے اتباع کو فریضہ بنایا جس کا ذکر قرآن مجید میں واضح وصریح الفاظ میں یوں فرمایا:

سورۂ تغابن آیت: ۱۲

○ "وَاَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ"

(اور تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی)

سورۂ نساء آیت: ۱۰۵

○ "لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ"

(تا کہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اس چیز کے ذریعے جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہے)

سورۂ احزاب آیت: ۶

○ "اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ"

(نبی مومنوں پر ان کی اپنی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں)

سورۂ آل عمران آیت: ۳۱

○ "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ"

(کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا)

یہ اور ان کے علاوہ متعدد دیگر آیات ایسی ہیں جن میں اسلامی معاشرہ آنحضرت ﷺ کی عمومی اور مطلق و جامع حاکمیت وولایت کے بعض یا تمام امور وخصوصیات مذکور ہیں،

اس موضوع کے بارے میں بحث و تحقیق کرنے والے ارباب دانش کو اپنے مقصود و مطلوب کے حصول کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا بغور مطالعہ کرے اور ہر گوشہ سے اس پر نگاہ کرے، اس کے بعد ان تمام آیات مبارکہ پر غور کرے جن میں اخلاقیات، عبادات، معاملات، سیاسیات، معاشرت و باہمی روابط سے تعلق رکھنے والے احکام ودستورات بیان کئے گئے ہیں تو اسے اپنے مقصود کی حقانیت کے واضح ومحکم دلائل تک رسائی پا نا یقینی ہو جائے گا کہ جس کے بعد اسے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہ رہے گی کیونکہ ان آیات مقدسہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اسلوب سخن اپنایا گیا ہے وہ بیان و مقصود میں کافی ووافی ہے کہ اس کی نظیر کسی دوسرے کلام و بیان میں نہیں مل سکتی۔

یہاں ایک نکتہ یہ بھی توجہ طلب ہے اور ارباب تحقیق کے لئے اسے اہمیت کی نگاہ سے دیکھنا لازم وضروری ہے کہ وہ آیات مبارکہ جن میں عمومی طور پر عبادات، جہاد، حدود و قصاص اور دیگر امور کی بابت احکام مذکور ہیں ان کا روئے سخن عام اہل ایمان کی طرف ہے نہ کہ صرف آنحضرتؐ کی طرف! آیات ملاحظہ ہوں:

سورۂ نساء، آیت: ۷۷

○ "وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ"

(اور نماز قائم کرو)

سورۂ بقرہ، آیت:۱۹۵

- ''وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ''

(اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو)

سورۂ بقرہ، آیت:۱۸۳

- ''کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ''

(تم پر روزے واجب کردیئے گئے ہیں)

سورۂ آل عمران، آیت:۱۰۴

- ''وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ''

(اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی دعوت دیں اور امر بالمعروف کریں اور نہی عن المنکر کریں)

سورۂ مائدہ، آیت:۳۵

- ''وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ''

(اور اس کی راہ میں جہاد کرو)

سورۂ حج، آیت:۷۸

- ''وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ''

(اور اللہ کے لئے جہاد کرو جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے)

سورۂ نور، آیت:۲

- ''اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ''

(اور زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)

سورۂ مائدہ آیت:۳۸

- ''وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَھُمَا''

(اور چور مرد اور چور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو)

سورۂ بقرہ، آیت:۱۷۹

- ''وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ''

(اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے)

سورۂ طلاق، آیت: ۲

- ''وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ''

(اور تم اللہ کے لئے گواہی دو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۳

- ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا''

(اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنی صفوں میں جدائی نہ آنے دو)

سورۂ شوریٰ، آیت: ۱۳

- ''اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ''

(یہ کہ دین پر قائم رہو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۴۴

- ''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ''

(اور محمد نہیں ہیں مگر رسول، ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں، پس اگر وہ مرجائیں یا قتل کیے جائیں تو تم اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور جو شخص اپنے پچھلے پاؤں پلٹ جائے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور بہت جلد اللہ شکر کرنے والوں کو جزاء عطا کرے گا)

یہ اور اس طرح کی دیگر کثیر آیات مبارکہ ایسی ہیں جن سب میں دین کی اجتماعی روش واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس پر ایمان لانے کا حکم دیا اور اپنے بندوں کے لئے اس کے انکار کو پسند نہیں کیا، اور تمام افراد بشر سے دین پر عمل کرنے کی تاکید کی، لہٰذا اس روش پر مبنی جو معاشرہ وجود میں آئے گا اس میں تمام افراد دین و احکام خداوندی پر عمل کرنے میں یکساں ہوں گے اور معاشرتی امور میں وہی با اختیار ہوں گے اس میں کسی کو کسی پر اختصاص حاصل نہ ہوگا اور معاشرتی امور میں آنحضرت ﷺ سمیت ہر شخص ذمہ داری کا حامل ہوگا چنانچہ اس حوالہ سے درج ذیل آیت مبارکہ میں ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۹۵

- ''اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ''

(میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، کہ تم ایک دوسرے ہی سے ہو)

اس آیت مبارکہ کے اطلاق اور عمومیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کے افراد جس طرح اپنے وجود میں آنے اور تکوینی و تخلیقی حوالوں سے اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے وابستہ اور اس کے مرہونِ منت ہیں اسی طرح احکام و دستورات کے

حوالہ سے بھی اسی سے مرتبط ومربوط ہیں اور خداوند عالم کسی بھی فرد کے کسی بھی عمل کو ضائع نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سورۂ اعراف، آیت: ۱۲۸

○ ''اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ''

(بے شک زمین کا مالک اللہ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام تقویٰ والوں کے لئے ہے)

ہاں، حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی امتیازی خصوصیات لوگوں کو دین الٰہی کی طرف بلانا، انہیں حق کا سیدھا راستہ دکھانا اور ان کی درست تربیت کرنا ہے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

سورۂ جمعہ آیت: ۱۲

○ ''یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ''

(ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے امور کی بابت اقدام کرنے، دنیا وآخرت میں ان کی ولایت وسرپرستی کرنے اور زندگی بھر ان کی امامت وسربراہی کرنے کے لئے متعین کیا گیا ہے۔

لیکن کسی بھی اہل بحث وتحقیق کو اس بات سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اس طرح کی ولایت وامامت کا نظام اس سلطنت وبادشاہت کے نظام سے قطعی مختلف ہے جس میں مسند اقتدار پر براجمان شخص خدا کے مال کو اپنے تخت وتاج کی حفاظت کے لئے غنیمت کا مال قرار دیتا ہے اور خدا کے بندوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور ان کے ساتھ جس طرح اس کی مرضی ہو اس کے مطابق سلوک کرتا ہے اور جو چاہتا ہے ان پر حکم نافذ کر دیتا ہے حالانکہ یہ طرز عمل ان اصولوں کے بھی منافی ہے جو صرف اور صرف مادی استفادہ کی بنیاد پر استوار ہیں اور ان میں مادی فوائد کے علاوہ کوئی چیز ملحوظ ومقصود نہیں مثلاً ڈیموکریسی وغیرہ، کیونکہ اس طرح کے طرز عمل اور نظام میں اسلامی نظام وآئین زندگی سے کسی بھی حوالہ سے مماثلت ومشابہت نہیں پائی جاتی، بلکہ اس طرح کے نظامہائے معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی وخامی یہ ہے...... جس سے وہ اسلامی نظام حیات سے قطعی مختلف ہیں...... کہ ان میں چونکہ صرف مادی استفادہ ہی ملحوظ ومقصود بلکہ اصل واساس قرار پایا ہے لہٰذا ان کے قالب ہی میں بندگان خدا کو بندگی کے بندھنوں میں جکڑنے اور ان کا استحصال کرتے ہوئے ان سے غلاموں جیسا سلوک کرنے کو بنیادی حیثیت دی گئی اور استعمار کی روح پھونکی گئی جو کہ انسانی استکبار وآمریت کے سوا کچھ نہیں کہ جس میں ہر چیز پر انسانی ارادہ کا تسلط ہوتا ہے اور انسان کا عمل بلکہ خود انسان ہی انسان کا اسیر ہو جاتا ہے اور ایسی روش اپناتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس پر اپنے اقتدار وتسلط کو یقینی بناتے ہوئے اسے اپنی مرضی وخواہش کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور کرے اور اپنی ذات کے دائرہ میں اسے پابند کر کے اس پر حکمرانی کرے، اور یہ بعینہ وہی سلطنتی استبداد ہے جو سابقہ زمانوں میں

معاشروں پر حاکم تھااور اب وہی سلطنتی استبداد ہمارے زمانہ میں جدید تہذیب وتمدن پر مبنی معاشرہ کے روپ میں سامنے آیا ہے کہ جس میں طاقتور طبقات کی طرف سے کمزور اقوام پر مظالم ڈھانا اور ان پر جبر وجور اور آمرانہ تسلط قائم کرنا معمول کی باتیں ہیں اور یہی وہ حالات ہیں جو سابقہ ادوار کی تاریخ میں محفوظ ہیں کہ جن کا مطالعہ ہمیں ان حالات کے پس منظر وحقائق سے آگاہی دلاتا ہے، تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مصر کے فرعونوں اور روم و فارس کے قیصری و کسروی سلطنتوں کے فرمانرواؤں میں سے جس کا دور بھی دیکھیں اس میں وہ اپنے کمزور عوام کو اپنی آمریت کا نشانہ بناتا تھا اور ہر ممکن طریقے سے رعایا کو اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کرتا تھا اور اگر کبھی اس پر اعتراض ہوتا تو وہ اس کے جواب میں...... اگر س کا جواب دیتا...... یوں کہتا تھا کہ اس طرح ہی سلطنت کے امور اور مملکت کی اصلاح کا نظام قائم رہ سکتا ہے اور حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آمرانہ اقدامات کا جواز یہ پیش کرتا تھا کہ ایسا کرنا اس کے اقتدار کا حق اور تقاضا وضرورت ہے، وہ اپنی بات منوانے کے لئے تلوار اور طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا بلکہ طاقت کے استعمال ہی سے اپنی حاکیت کو ثابت کرنے میں کوشاں رہتا تھا، ان حالات کے تناظر میں اگر آپ عصر حاضر میں رائج سیاسی نظاموں کو حکام ورعایا کے درمیان پائے جانے والے روابط وتعلقات پر غور سے نگاہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ طاقتور طبقے، کمزور طبقوں کو کس طرح اپنے مظالم کا نشانہ بناتے ہیں اور اپنی غلط چاہتوں کا اسیر کرتے ہیں، اسی سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ تاریخ اپنے واقعات کے ساتھ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور ہمیں اپنی فکر و تصویریں دکھا کر ہمارے دور کا مذاق اڑا رہی ہے اور اس کا یہ سلسلہ جاری وساری ہے البتہ شخصی استبداد کی صورت بدل کر اب موجودہ اجتماعی شکل میں اپنے آپ کو دہراتی ہے جبکہ اس میں اصل واساس وہی اصل واساس ہے، وہی روح اور وہی نفسانی خواہشیں ہیں لیکن اسلام کا نظام حیات اس سے قطعی مختلف اور شخصی آمریتوں کی وحشت ناک صورتوں سے مبرا ہے اور اس حقیقت کا واضح ثبوت سیرت نبوی ﷺ اور عہد رسالت کی فتوحات اور معاہدوں سے ملتا ہے کہ جن میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے انسانیت نواز اسلامی وفطری اصولوں کی پاسداری کو مقدم اور یقینی بنایا۔

موجودہ نظامہائے معاشرت اور اسلامی نظام معاشرت کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ موجودہ نظاموں میں افراد معاشرہ کے درمیان طبقاتی گروہ بندیاں پائی جاتی ہیں جو کہ معاشرہ کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہیں کیونکہ مال و دولت اور جاہ ومنزلت...... اقتدار و منصب...... وغیرہ جیسے امور کو طبقہ بندیوں کی بنیاد قرار دیا جائے تو معاشرے میں فتنہ وفساد کا طوفان امڈ آئے گا اور انہی حوالوں سے مختلف طبقات کا جنم لینا بالآخر معاشرہ میں انسانی معیارہائے فضیلت پر پانی پھیر دینے کا باعث بنتا ہے لیکن جہاں تک اسلامی معاشرہ کا تعلق ہے تو اس میں افراد کی ہم رنگی اس حد تک وسعت رکھتی ہے کہ کسی کو کسی پر تقدم و برتری اور فخر و بزرگی کا حق حاصل نہیں البتہ افراد کے درمیان طبع انسانی کی بنیاد پر جو فرق ممکن ہے اور اس سے ہرگز انکار نہیں ہوسکتا وہ صرف اور صرف تقویٰ کے حوالہ سے ہے کہ جس کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے مربوط ہے لوگوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں

چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ حجرات، آیت: ۱۳

○ "یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ"

(اے لوگو، ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شعبے اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً تم میں سے زیادہ عزت و بزرگی والا شخص اللہ کے نزدیک وہی ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہو)

ایک مقام پر یوں ارشاد ہوا،

سورۂ بقرہ، آیت: ۱۴۸

○ "فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ"

(تم نیکیوں میں سبقت لو)

بنابرایں اسلامی معاشرہ میں حاکم و عوام، فرمانروا اور رعایا، امیر و مامور، رئیس و مرؤوس، آزاد و غلام، مرد و عورت، مالدار و نادار اور چھوٹا و بڑا سب ہی قانون کی پاسداری کے حوالہ سے یکساں و مساوی حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرتی امور و روابط میں ان کے درمیان کسی قسم کا طبقاتی فرق نہیں پایا جاتا بلکہ آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے معاشرتی نظام میں تمام افراد کو برابر حیثیت دی اور کسی کو کسی پر قانون کی پاسداری و عملداری کے حوالہ سے امتیاز نہیں دیا۔

اسلامی نظام معاشرت کی دیگر نظاموں سے ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکمران طبقہ معاشرتی امور میں کسی طرح سے دوسرے افراد سے مختلف و ممتاز نہیں بلکہ سب کی حیثیت برابر ہے، قانون کی پاسداری و عملداری میں سب یکساں ہیں اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو خیر کی دعوت دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔

بہر حال اسلامی نظام اور دیگر معاشرتی نظاموں میں مختلف حوالوں سے فرق پایا جاتا ہے کہ ہر اہل فکر و نظر اس سے بخوبی آگاہ و مطلع ہے اور وہ کسی محقق سے پوشیدہ نہیں۔

البتہ یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں بخوبی آشکار تھا اور آپ ﷺ نے معاشرہ میں قانون کی حکمرانی کو یقینی بنایا لیکن آپ ﷺ کی رحلت کے بعد اہل اسلام دو حصوں میں بٹ گئے، اکثر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں خلیفہ و حکمران کا انتخاب عام مسلمان کریں گے جبکہ شیعہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے حاکم و فرمانروا کا انتخاب عام لوگ نہیں بلکہ وہ خود اللہ و رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منصوص و متعین ہو گیا ہے، جو کہ بارہ امام ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ علم الکلام کی کتب میں موجود ہے، یعنی عام مسلمانوں کا نظریہ انتخاب کی بنیاد پر خلیفہ و حکام کا تعین ہے اور شیعوں کا نظریہ انتصاب اور خدائی فیصلہ پر مبنی ہے کہ اس تعین کا حق اللہ اور رسول ﷺ ہی کو حاصل ہے۔

بہر حال اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد اور امام کے زمانہ غیبت میں...... جیسا

کہ ہمارے اس دور میں ہے...... معاشرتی امور کے ذمہ دار افراد کا انتخاب عام اہل اسلام کرتے ہیں لیکن دنیوی امور میں معاشرتی حکمرانی کا جو معیار قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ معاشرہ کے حاکم کا تعین سیرت نبوی ﷺ کی بنیاد پر ہو جو کہ نظام امامت سے عبارت ہے نہ کہ ملوکیت و بادشاہت اور امیر اطوری وغیرہ! اور اس میں قوانین کی پاسداری کا عمل کسی طرح کی تبدیلی کے بغیر ہو اور یہ کہ حالات و تقاضائے روزگار کے مطابق احکام و دستورات شرعیہ کے علاوہ دیگر امور میں مشاورت کے ساتھ اقدام کیا جائے، ان حقائق کا ثبوت ان تمام مذکورہ آیات مبارکہ سے ملتا ہے جن میں آنحضرتؐ کی ولایت و حاکمیت کا تذکرہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ درج ذیل آیت سے مزید تاکید ہوتی ہے:

سورۂ احزاب، آیت: ۲۱

○ ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ''

(بے شک تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے)

(۱۳) اسلامی مملکت کی سرحدیں اعتقادی ہیں جغرافیائی نہیں

اسلام نے معاشرہ کی تشکیل میں قومیت کی بنیاد پر گروہ بندیوں کی سختی سے ممانعت کی ہے اور معاشرے میں اس کی اثر گزاری کے اسباب پر قدغن لگاتے ہوئے افراد کی اجتماعی حیثیت کے تحفظ کو یقینی بنانے پر زور دیا ہے کیونکہ قومیت کی اصل و اساس بدوی طرز فکر اور صحرائی سوچ ہے کہ جس میں زندگی گزارنے کے طور و اطوار قبیلوں اور علاقوں سے وابستگی کے مظاہر ہوتے ہیں اور یہی دو عوامل یعنی بدوی و صحرائی زندگی اور علاقائی و جغرافیائی فرق ہی آب و ہوا، سردی و گرمی اور سرسبز و شادات اور بنجر و غیر آباد زمینی حوالوں کے نتیجہ میں نوع انسانی کے شعبوں، قبیلوں اور رنگ و زبان کی بنیاد پر وجود میں آنے والے گروہوں کی تشکیل و صورت بندی کا سبب ہوا...... اس سلسلہ میں مربوطہ مقام پر تفصیلی تذکرہ ہو چکا ہے...... پھر یہی دو عوامل اس بات کا سبب ہوئے کہ ہر قوم نے کرۂ ارضی کے کسی حصہ کو آباد کر کے اس میں اپنی کوششوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے اپنے مخصوص طور طریقے اپنا کر اس حصہ کو اپنے ''وطن'' سے موسوم کر دیا کہ جس سے محبت و الفت کا رشتہ قائم کرنے لگے اور اس کے دفاع میں اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لانے لگے، یہی بات انہیں اپنی ان طبعی ضرورتوں کو پورا کرنے کی راہ پر لائی جن کا پورا کرنا فطرت کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے لیکن اس میں اصل انسانی فطرت کے منافی بات یہ شامل ہو گئی کہ نوع انسانی کی اجتماعی زندگی کو وحدت کی لڑی میں پرونے سے دوری اختیار ہوئی جبکہ انسانی فطرت کا بنیادی تقاضہ ہی یہ ہے کہ نوع بشر معاشرتی اکائی کی حامل ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ طبیعۃ الوجود تمام مختلف قوتوں کے یکجا ہونے اور ان کی باہمی ترتیب و ترکیب کے ساتھ ایک ہی اکائی میں پرو دیئے جانے کی خواہاں ہوتی ہے تا کہ اس طرح صحیح و درست طریقہ سے اپنی

اعلیٰ اغراض واہداف کو حاصل کر سکے اور یہ بات اصل مادہ کے کسی بھی وجودی عنصر کے قالب میں ڈھلنے کی کیفیات سے بخوبی معلوم ہوتی ہے اور اس کا مشاہدہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ ان تدریجی مراحل میں نبات، حیوان اور پھر انسان کی وجودی صورتگری کے تقاضے اپنی تکمیل کی جانب بڑھتے ہیں۔ (ممکن ہے مؤلف کے اس بیان سے انسانی وجود کے ارتقائی مراحل کا اشارہ سمجھا جائے اور اس کے وجودی تشخص کی نوعی حیثیت کے حوالہ سے غلط فہمی پیدا ہو جبکہ اصل حقیقت اس سے مختلف ہے اور انسان کی وجودی شناخت اپنی اصل ذاتی ونوعی حقیقت وحیثیت کی بناء پر ہے مادہ کی ارتقائی صورت پر نہیں کہ جسے جماد پھر نبات پھر حیوان اور پھر انسان تک لے جایا جائے مؤلف نے مادہ کے ارتقائی سفر کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ نوعی تشخص کی بحث میں شامل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مستقل مخلوق پیدا کیا ہے اور اس میں مادہ کے ارتقائی مراحل کا ذکر نوعی فرق سے قطعی مختلف ہے، مترجم) جہاں تک ''وطن'' کے حوالہ سے قوموں کی شعبہ بندی کا تعلق ہے تو اس سے جہاں ایک ''اہل وطن'' گروہ کے افراد ایک معاشرہ میں اکٹھے ہوتے ہیں اور ان میں اجتماعی اکائی پیدا ہوتی ہے وہاں وہ دیگر ''اہل وطن'' گروہوں کے معاشروں سے جدا ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت اس اکائی کی ہو جاتی ہے جو ایک وجود کے باوجود روح اور جسم میں جدائی کے حامل ہیں کہ ایک ''وطن'' کی وحدت دیگر وطنی وحدتوں کے تناظر میں تفرقہ کا سبب بنتی ہے جس کے نتیجہ میں اصل انسانیت، وحدت واجتماعیت سے کوسوں دور ہو کر تفرقہ و پراکندگی کے دلدل میں پھنس جاتی ہے جبکہ وہ اس سے دوری اختیار کرتی تھی، اور اب نئی وجود میں آنے والی اکائی دیگر نئی وجود میں آنے والی اکائیوں (یعنی معاشرتی اکائیوں) سے اسی طرح برتاؤ کرتی ہے جس طرح انسان کائنات کی دیگر اشیاء سے سلوک کرتا ہے اور انہیں اپنے استعمال میں لانے کے ہر ممکن طریقے اختیار کرتا ہے مثلاً ان کی وجودی توانائیوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے مفادات کے حصول وتحفظ کو یقینی بناتا ہے کہ جسے آج کی اصطلاح میں استعمار واستحصال کہا جاتا ہے چنانچہ اس دنیا کے آغاز سے اب تک مسلسل تجربات نے اس تلخ حقیقت کو ثابت کر دیا ہے اور ہم نے سابقہ بحثوں میں جن آیات مبارکہ کو ذکر کیا ہے ان سے بھی اس کا واضح اور کافی ووافی ثبوت فراہم ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسلام نے گروہ بندیوں، خود ساختہ امتیازات اور تفرقہ بازیوں کی نفی کرتے ہوئے ان پر سرخ لکیر پھیر دی ہے اور معاشرہ کی اصل واساس قومیت، نسل، وطن وغیرہ کی بجائے عقیدہ ونظریہ کو قرار دیا ہے یہاں تک کہ زوجیت و قرابتداری جیسے امور میں بھی ایک دوسرے کے وجود سے استفادہ و بہرہ مندی اور میراث میں بھی مکان وطن وغیرہ کی بجائے عقیدۂ توحید میں اشتراک کو اصل معیار مقرر کیا ہے، چنانچہ اس کی بہترین مثال بلکہ عمدہ شواہد میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اس مقدس دین کے احکام ودستورات پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے کسی بھی موضوع ومسئلہ میں عدم توجہ کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی کسی سلسلہ کو مہمل چھوڑا ہے لہٰذا اسلامی معاشرہ کا فرض ہے کہ دین کی عظمت وغلبہ اور پرچم اسلام کی سربلندی کے زمانہ میں اقامہ دین کا بھرپور اہتمام کریں اور اس کی بابت تفرقہ کا شکار نہ ہوں اور اگر کبھی ایسا دور آئے کہ دشمنانِ دین غلبہ پالیں اور اہل دین کو مغلوب وکمزور کر دیں تو اسلامی معاشرہ کے افراد احیاء دین اور اعلاء کلمہ حق کے لئے

مقدور بھر اقدامات بجالائیں یہاں تک کہ اگر ایک مسلمان بھی باقی رہے تو اس پر لازم وضروری ہے کہ وہ دینی تعلیمات کو اپنی زندگی کی اصل واساس قرار دے کر ان پر عمل پیرا ہو اور جس قدر ممکن ہو دین پر عمل کرے اور اس سے وابستہ ہو خواہ دل میں مضبوط عقیدہ رکھنے اور اپنے واجبات وفرائض ادا کرنے میں اشاراتی روش اختیار کرنے کی صورت میں کیوں نہ ہو۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل اس طرح ہوئی ہے کہ اس کی بقاء ہر حال اور ہر کیفیت میں ممکن ہے خواہ حاکیت کی صورت میں یا محکومیت کی صورت میں! غالبیت کی صورت میں یا مغلوبیت کی صورت میں! ترقی کی صورت میں یا تنزلی کی صورت میں! ظاہر بظاہر یا مخفی وپوشیدہ! طاقت کے ساتھ یا کمزوری کے ساتھ! ہر حالت میں اس کا وجود امکان پذیر ہے چنانچہ اس سلسلہ میں وہ قرآنی آیات مبارکہ جن میں تقیہ کا حکم مذکور ہے بہترین ثبوت فراہم کرتی ہیں مثلاً:

سورۂ نحل، آیت: ۱۰۶

- ''مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ''

(جو شخص اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس سے انکار کرے، مگر وہ کہ جسے مجبور کیا گیا ہو جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۲۸

- ''اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً''

(مگر یہ کہ تم ان سے جس طرح بھی ڈرتے ہو)

سورۂ آل عمران، آیت: ۱۰۲

- ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''

(اے ایمان والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح اس کے تقویٰ کا حق ہے، اور تم نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں!)

سورۂ تغابن، آیت: ۱۶

- ''فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ''

(پس تم جس قدر کر سکو تقوائے الٰہی اختیار کرو)

(۱۴) اسلام تمام امور میں اجتماعی دین ہے

اسلام کے اجتماعی دین وآئین ہونے کا ثبوت قرآن مجید کی آیت مبارکہ ''وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (اور تم باہمی صبر اور ربط اختیار کرو اور تقوائے الٰہی اپناؤ تا کہ تم فلاح وکامیابی سے ہمکنار ہو سکو) کہ جس کی تفسیر پہلے

ذکر ہو چکی ہے اور دیگر کثیر آیات میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی صفت ہونا اس کے تمام احکام و دستورات اور تعلیمات سے بخوبی ثابت ہوتا ہے البتہ ہر موضوع اور مورد میں اجتماعیت کا معنی و مفہوم اس موضوع و مورد سے مناسبت و موزونیت کا حامل ہوتا ہے اور اسی حد تک ہی تصور کیا جاسکتا ہے کہ جس میں اس کا عملی صورت میں ڈھلنا امکان پذیر ہو اور اس سے مطلوبہ ہدف تک رسائی و عملی آمادگی خارج از امکان نہ ہو، بنابرایں اس سلسلہ میں بحث و تحقیق کرنے والے اہل دانش وارباب فکر و نظر پر لازم و ضروری ہے کہ وہ اپنے تحقیقی عمل میں دونوں ہی پہلوؤں کو ملحوظ رکھیں:

(۱) مختلف موارد میں احکام کا اجتماعی صفت ہونا مختلف صورتوں کا حامل ہے۔

(۲) اجتماعی احکام میں واجب وغیر واجب کا فرق:۔

ان دونوں پہلوؤں کے تناظر میں ہر محقق مطلوبہ نتیجہ حاصل کرسکتا ہے چنانچہ پہلے حوالہ سے بحث کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ خداوند عالم نے معاشرہ کی تشکیل میں جو اجتماعی احکام و دستورات صادر فرمائے ہیں ان میں سے ایک جہاد ہے کہ جو براہ راست فرمان ہے اور اس کا دائرہ دفاع کی کامیابی تک وسعت رکھتا ہے، یہ اجتماعی صفت ہونے کی ایک صورت ہے، دوسرے حوالہ سے روزہ اور حج کے احکام ہیں کہ جو استطاعت والے شخص پر لاگو ہوتے ہیں یعنی وہ شخص جو ان واجبات کی ادائیگی کرسکتا ہو کہ ان اعمال کی لازمی صورت لوگوں کا روزوں اور حج میں اکٹھا ہونا ہے اور اس کی تکمیل عیدین (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) کی ادائیگی کی شکل میں ہے کہ جس میں نماز کی ادائیگی کا حکم ہے، اور یومیہ نمازوں کو واجب عینی قرار دیا کہ ہر مکلف پر ان کا بجالانا لازمی ہے لیکن ان میں باجماعت ادائیگی لازمی نہیں اور اس کی تلافی و تدارک ہر ہفتہ نماز جمعہ کی باجماعت ادائیگی کے ضروری ہونے کی صورت میں ہے کہ ہر جمعہ کو اسے ادا کیا جائے اور اس میں چار فرسخ کا فاصلہ شرط ہے یعنی چار فرسخ کے فاصلے پر رہنے والے پر نماز جمعہ واجب ہے جو کہ باجماعت (اجتماعی صورت میں) ہے، تو یہ ہے احکام کے اجتماعی صفت ہونے کی دوسری صورت!

اور جہاں تک دوسرے حوالہ کا تعلق ہے تو اس کے تناظر میں احکام کی صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے بعض چیزوں میں اجتماع کو بلاواسطہ واجب و لازم قرار دیا ہے جیسا کہ آپ مذکورہ بالا بیانات میں اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ اور بعض چیزوں میں براہ راست اجتماعیت کو پسند کیا ہے لیکن واجب قرار نہیں دیا جیسا کہ فریضہ نمازوں میں ہے کہ ان کی ادائیگی واجب مگر ان کا باجماعت ادا کرنا واجب نہیں بلکہ سنت و مستحب ہے البتہ سنت ان کے باجماعت ادا کرنے پر قائم ہو چکی ہے یعنی انہیں باجماعت ہی ادا کیا جاتا ہے تو لوگوں پر اس سنت کا قائم رکھنا ہی ضروری بنتا ہے چنانچہ اس کا ثبوت حضرت رسول خدا ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے ملتا ہے جس میں آپ ﷺ نے ان مسلمانوں کے بارے میں جنہوں نے باجماعت ادائیگی کو ترک کیا یوں فرمایا: ”جو لوگ مسجد میں نماز ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں ان کے بارے میں اب ایسا لگتا ہے کہ ہم حکم دیں کہ

ان کے گھروں کے دروازوں پر لکڑیاں لے جا کر آگ بھڑکا دی جائے جو ان کے گھروں کو جلا کر خاکستر بنا دے''۔ اس طرح آنحضرت ﷺ نے اجتماعیت کے قیام کے لئے سنت وطریقہ قائم کر دیا کہ اب اہل اسلام پر اس سنت وطریقہ کا تحفظ ہر ممکن صورت میں اور ہر قیمت پر لازم وضروری ہے۔

تو یہ وہ امور ہیں جن کی بابت بحث وتحقیق کتاب وسنت کے ذریعے فقہی استنباط پر مبنی ہے اور اسلامی فقہ ہی اس حوالہ سے واضح بیان کی حامل ہے۔ لیکن اس مقام پر جو بات سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ جس کے بارے میں بحث وتحقیق ہو وہ ہے اسلام جبکہ یہ حقیقت کسی بیان ووضاحت کی محتاج نہیں کہ اسلام نے اپنے تمام دستورات وقوانین خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات وسیاسیات سے ہو اور خواہ اخلاق وپاکیزہ صفات سے ہو سب میں اجتماعیت کو بنیادی حیثیت دی ہے اور ان سب میں اجتماعیت کو ملحوظ رکھا ہے۔

ہم اس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اسلام لوگوں کو دین فطرت کی طرف بلاتا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ وہی حق ہے کہ جس کی بابت کسی طرح کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا اور کثیر قرآنی آیات مبارکہ ایسی ہیں جن میں اسی مطلب کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ ان کے بارے میں کسی اعتراض کی گنجائش بھی نہیں پائی جاتی اور یہ بات دین اسلام کی فطرت پسندی کی پہلی کڑی ہے جس میں لوگوں کے طرز فکر کے مختلف ہونے اور اخلاق وعادات کے فرق کے باوجود کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا اور تمام افراد بشر اس پر کامل اتفاق رکھتے ہیں کہ حق کی پیروی واجب ولازم ہے۔ (الحق یجب اتباعه)

پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام ان لوگوں کو بے قصور اور قابل معافی قرار دیتا ہے جن پر حق واضح نہیں ہوا اور دلائل روشن نہیں ہوئے اگرچہ حقائق ودلائل ان کے گوش گزار ہو چکے ہیں، چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا:

سورۂ انفال: آیت ۴۲:

- ''لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ''

(تاکہ جو شخص ہلاک ہو وہ حق واضح ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ حق واضح ہونے کے بعد زندہ ہو)

سورۂ نساء، آیت ۹۸۔۹۹:

- ''إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ۝''

(سوائے ان لوگوں کے کہ جنہیں کمزور کر دیا گیا مردوں میں سے، عورتوں میں سے اور بچوں میں سے جو کہ کوئی راہ چارہ نہیں رکھتے اور نہ ہی حق کا راستہ ڈھونڈ پاتے ہیں امید ہے کہ انہی لوگوں کو خدا بہت جلد معاف کر دے گا اور خدا تو ہے ہی درگزر کرنے والا، معاف کرنے والا)

اس آیت کے اطلاق اور معنوی وسعت کو دیکھیں کہ اس میں جملہ ''لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا'' کے

الفاظ ہر اہل فکر ونظر اور اپنے تئیں بحث وتحقیق کے لئے آمادگی کا حامل سمجھنے والے کو دعوتِ عام دیتے ہیں کہ وہ دین سے تعلق رکھنے والے معارف کے بارے میں نہایت باریک بینی کے ساتھ غور وفکر کرے اور ان سے مربوط امور میں اپنی فکری توانائیاں بروئے کار لائے کیونکہ قرآنی آیات مبارکہ تفکر، تعقل وتذکر کی ترغیب دلانے میں بھری ہوئی ہیں، اور یہ حقیقت معلوم وآشکار ہے کہ ذہنی و بیرونی عوامل کا مختلف ہونا افکار وافہام کے مختلف ہونے میں اثر انداز ہوتا ہے کہ ان کے تصور وتصدیق اور حقائق ومفاہیم تک رسائی کے مراحل میں اس کی اثرگزاری ظاہر ہوتی ہے۔ اور اسی سے ان اصولوں میں فرق پیدا ہوجاتا ہے جو اسلامی معاشرہ کی اصل واساس قرار پاتے ہیں جیسا کہ اس حوالہ سے مربوط مطالب ذکر ہو چکے ہیں البتہ دو اشخاص کے فہم وفکر کا مختلف ہونا چونکہ علم معرفت نفس، علم الاخلاق اور علم الاجتماع کا مسلمہ اصول ہے لہٰذا جب اُس کے اصل سبب کے بارے میں غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بازگشت درج ذیل تین امور میں سے کسی ایک کی طرف ہوتی ہے:

(۱) نفسانی اخلاق وباطنی صفات کا مختلف ہونا، اچھی وبری دونوں صفتوں سے مربوط قوتوں سے تعلق کے حوالہ سے! کیونکہ انسانی علوم ومعارف میں اُن مختلف صلاحیتوں کے تناظر میں ان قوتوں کی اثرگزاری بہت وسیع ہوتی ہے جو لوحِ ذہن میں ان صفات کی صورت گری کرتی ہیں، بنابرایں کسی منصف مزاج شخص کا ادراک اور ذہنی فیصلہ جھگڑالو وسرکش شخص کے ادراک اور ذہنی فیصلہ جیسا نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی اعتدال پسند شخصیت کے حامل انسان کی فکری رسائی کسی جلد باز ومتعصب اور نفسانی خواہشوں کے اسیر ایسے شخص کی فکری رسائی جیسی ہوتی ہے جو ہر کس وناکس کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جس کے پیچھے جاتا ہے وہ اسے کہاں لے جائے گا اور اس سے کیا مطلوب رکھتا ہے؟ جبکہ دینی تربیت اس طرح کے اختلاف کو بخوبی دور کرسکتی ہے کیونکہ اس کی بنیاد ایسی ہے کہ اس میں دینی اصولوں اور معارف وعلوم سے ہمرنگی وہم آہنگی کے تمام تقاضے پورے ہوئے ہیں اور اس کی اخلاقیات کا سرچشمہ دینی اصول ہیں جو کہ مکارم الاخلاق ہی سے عبارت ہیں، اس حوالہ سے قرآنی آیات یوں گویا ہیں:

سورۂ احقاف، آیت ۳۰:

- ''كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ''

(وہ کتاب ہے جو موسیٰ کے بعد اُتاری گئی کہ وہ اپنے ماقبل کی تصدیق کرتی ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے)

سورۂ مائدہ: آیت ۱۶:

- يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(اس کے ذریعے اللہ اس کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی رضا ومرضی کی پیروی کرے کہ اسے سلامتی کے راستے دکھاتا ہے انہیں اپنے اذن کے ساتھ، اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف ہدایت کرتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہے)۔

سورۂ عنکبوت: آیت ۶۹:

○ ''وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ''

(اور جن لوگوں نے ہم میں جہاد کیا تو ضرور ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

ان آیات مبارکہ کا زیر نظر موضوع پر منطبق ہونا ظاہر و واضح ہے۔

(۲) افعال کا مختلف ہونا، جو عمل حق کے منافی ہو مثلاً گناہ و معصیت اور انسانی ہوسرانیاں یعنی دھوکہ بازی وسوسہ اندازی وغیرہ اس سے ہر انسان بالخصوص سادہ لوح افراد کی لوح ذہن پر غلط و فاسد افکار ثبت ہو جاتے ہیں اور پھر شبہات و باطل آراء و نظریات کا ایک تلاطم ذہنوں پر چھا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں سوچیں مختلف ہو جاتی ہیں اور حق کی پیروی سے منہ موڑنے کے جذبات ابھر آتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اسلام اس طرح کے اختلاف کو دور کرنے میں اہم و بنیادی کردار ادا کرسکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے اس کے سدّباب کو یقینی بنا سکتا ہے چنانچہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے تین راہیں اپناتا ہے:

(۱) معاشرہ کو ہمیشہ دینی دعوت عام کرنے کا حکم دیتا ہے۔

(۲) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کو ہر فرد کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔

(۳) کینہ پرور اور شبہات کا شکار افراد کو معاشرہ سے دور چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔

ان امور کی بابت قرآنی آیات مبارکہ یوں گویا ہیں:

سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۴:

○ ''وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ''

(تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی دعوت دے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے)

اس آیت مبارکہ میں تین چیزیں مذکور ہیں، ایک دعوت الی الخیر یعنی نیکی کی طرف بلانا، دوسری امر بالمعروف اور تیسری نہی عن المنکر، نیکی کی طرف بلانا صحیح و حق عقیدہ کی مضبوطی اور دلوں میں اس کے جگہ کر جانے کو یقینی بنانے میں مدد دیتا ہے کیونکہ جب بار بار نیکی کی طرف بلایا جائے اور اس کی اہمیت و آثار کو یاد دلایا جائے تو اس کے نتیجہ میں دلوں کی توجہات نیکی کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہیں اور پھر ان کی عملی صورت کی یقینی راہ کھل جاتی ہے، اور جہاں تک امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تعلق ہے تو ان کی اثر گزاری سے دلوں میں صحیح عقائد کے راسخ ہونے کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ انعام، آیت ۶۸:

○ ''وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ

یَتَّقُوْنَ ۞ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ"

(اور جب آپ دیکھیں کہ کچھ لوگ ہماری آیات کے بارے میں لب کشائی کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ان سے روگردانی کرلیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی بات میں مصروف ہو جائیں، اور اگر شیطان آپ کو یہ بات بھلوانا چاہے تو آپ واضح بیان کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہی چھوڑ دیں، اور جو لوگ تقویٰ اختیار کریں ان کا معاملہ دوسرا ہے لیکن یہ سب کچھ یاددہانی پر مشتمل ناصحانہ بیان ہے تاکہ وہ تقویٰ کی راہ اپنائیں، اور ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود اور مذاق بنالیا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا ہے، تاہم آپ یاددہانی کرواتے رہیں کہ ممکن ہے ان کے دلوں پر اثر کرے اور وہ اپنے کئے پر غور کریں)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے معارف الٰہیہ اور دینی حقائق میں شبہات، اعتراضات، استہزاء و مذاق اُڑانے کی غرض سے بات چیت کرنے کی سخت ممانعت کی ہے خواہ جزئی صورت میں ہو یا کنایہ و اشارہ کے انداز میں ہو، اس کے ساتھ ساتھ ان آیات میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کرنے سے دینی امور و معارف میں حقیقت پسندی کا رجحان ختم ہو جاتا ہے اور ان کی بابت مذاق اور بے مقصد و بے معنی بحثوں کی راہ کھل جاتی ہے جو کہ کسی بھی صورت میں درست قرار نہیں دی جاسکتی، اور اس نکتہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کے اعمال کا اصل سبب دنیاوی زندگی کی چمک دمک کے دھوکہ میں آجانا ہے کہ اگر اس سے چھٹکارا مقصود ہو تو نیک تربیت اور خداوند عالم کی یاد میں رہنا ہی واحد حل ہے۔

(۳) بیرونی عوامل کا اثر انداز ہونا، اس حوالہ سے گھر سے دوری اور دینی معارف تک عدم رسائی سوائے معدودے چند امور یا تحریف شدہ حقائق کے یا افراد کے خاص مزاج کی وجہ سے پیدا ہونے والی فکری ناتوانی کے نتیجہ میں دینی حقائق سے آگاہی و آشنائی سے محرومی، اختلافات کا سبب بنتی ہے کہ جس کا واحد حل تبلیغ دین کے سلسلوں کو وسعت دینا اور حق کی طرف دعوت دینا اور دینی تربیت کا حلقہ وسیع کرنا ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو اسلام کے تبلیغی نظام کے امتیازات میں سے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد خداوندی ہے:

سورۂ یوسف، آیت ۱۰۸:

○ "قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ"

(کہہ دیجئے کہ یہی میرا راستہ ہے، میں بصیرت و آگاہی کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور ہر وہ جو میری پیروی کرتا ہے)۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جو کسی چیز سے بخوبی آگاہی و بصیرت رکھتا ہو وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے کہ اس کی بات لوگوں کے دلوں میں کس قدر جگہ پاتی ہے اور افراد کے مختلف مزاجوں اور سننے والوں کے مختلف طرز تفکر کی بناء پر کس قدر اثر گزاری ہوتی ہے لہٰذا وہ ہر شخص کی قوت فہم و ادراک کے عین مطابق اپنی توانائی بروئے کار لاکر اسے اپنی بات سناتا

اور اپنا پیغام بھیجتا ہے، اس حوالہ سے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد گرامی فریقین کی کتب میں مذکور ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''انا معاشر الانبیاء نکلم الناس علی قدر عقولھم ''ہم گروہ انبیاء لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کرتے ہیں، اور خداوند عالم نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ توبہ، آیت ۱۲۲:

○ ''فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ''

(پس ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر قوم سے ایک گروہ جائے تا کہ دین فہمی کے زیور سے آراستہ ہو اور واپس آکر اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کرے تا کہ وہ خدا کے عذاب سے ڈریں)

یہ ہیں وہ تین اسباب و عوامل جو معاشرہ میں عقائد و فہم حقائق کے حوالہ سے افراد کے درمیان اختلاف کو جنم دیتے ہیں، اسلام ان میں سے بعض کی روک تھام اور سدباب ان کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی کرتا ہے اور بعض سے نمٹنے کے لئے ان کے رونما ہونے کے بعد اقدامات کرتا ہے۔

ان سے قطع نظر اور ان سے بالاتر یہ کہ اسلام نے جو معاشرتی دستورات مقرر فرمائے ہیں وہ معاشرہ میں رونما ہونے والے شدید ترین اختلافات کی روک تھام میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، ان کی بابت پہلی بات یہ ہے کہ ہر حال میں سیدھی راہ اپنائی جائے یعنی صراط مستقیم کو اختیار کیا جائے جو کہ مقصد تک پہنچنے کی آسان ترین راہ ہے اور اختلافی راہوں کی طرف جانے سے سختی کے ساتھ اجتناب برتا جائے، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

سورۂ انعام: آیت ۱۵۳:

○ ''وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ''

(اور یہ ہے میرا سیدھا راستہ، پس تم اس پر چلو اور دیگر راستوں پر نہ چلو ورنہ وہ تمہیں خدا کے راستہ سے دور اور متفرق کر دیں گے، اس بات کی تاکید خدا نے تمہیں کی ہے تا کہ تم تقویٰ اختیار کر سکو)۔

سورۂ آل عمران: آیت ۱۰۲۔۱۰۳

○ ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا.....''

(اے ایمان والو! تقوائے الٰہی اختیار کرو جس طرح تقوائے الٰہی کا حق ہے اور ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں! اور تم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو......)

اس آیت کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ یہاں اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے جس میں دینی حقائق و معارف بیان کئے گئے ہیں یا جیسا کہ پہلی دو آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی قدر ہے کیونکہ ان میں یوں ذکر ہوا ہے۔

سورۂ آل عمران: آیات ۱۰۰۔۱۰۱

○ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ۝ وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

(اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں میں سے کسی گروہ کی پیروی کرو جنہیں کتاب دی گئی تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد کافروں میں پلٹا دیں گے، اور تم اللہ کا انکار کیونکر کر سکتے ہو جبکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور تم میں اس کا پیغمبر بھی موجود ہے، اور جو شخص اللہ سے وابستہ ہو جائے تو وہ سیدھی راہ کی ہدایت پا گیا)

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں پر واجب ولازم ہے کہ دینی معارف پر متفق ہو جائیں، اپنے افکار کو ایک دوسرے سے مرتبط و پیوستہ کریں اور تعلیم و تعلّم سے لو لگائیں، اس طرح ہر فکری حادثہ سے بچ جائیں گے اور جو آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں ان کی بابت ہر طرح کے شبہ و غلط فہمی سے محفوظ رہیں گے اور ان آیات میں غور و فکر اور تدبر کے نتیجہ میں باہمی اختلاف کی بیخ کنی میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے۔

سورۂ نساء: ۸۲

○ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا

(کیا وہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے کہ اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے)۔

سورۂ عنکبوت: آیت ۴۳

○ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

(اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انہیں عمل کرنے والوں کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں سکتا)

سورۂ نحل: آیت ۴۳

○ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(پس تم اہل ذکر سے پوچھو اگر تم خود علم نہیں رکھتے ہو)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا یا تدبر کرنے والے کی طرف رجوع کرنے کا حکم دینا جو کہ دین کی بھاری بھرکم حقیقتوں کا علم رکھتے ہیں، لوگوں کے درمیان اختلاف کو دور کر کے ان کے سامنے اس حق و حقیقت کو واضح و آشکار کرنے کا ذریعہ ہے جس کی پیروی کرنا لوگوں پر واجب ولازم ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ نحل، آیت: ۴۴

○ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝

(اور ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو واضح طور پر بیان کریں کہ اُن کے لئے کیا

نازل کیا گیا ہے اور تا کہ وہ غور وفکر کریں)

اس آیت سے قریب المعنیٰ آیت یہ ہے:

سورۂ نساء، آیت: ۸۳

○ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ

(اور اگر وہ رسول اور اولی الامر کی طرف جو انہی میں سے ہے رجوع کریں تو تحقیق واستنباط کرنے والے لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں گے)

سورۂ نساء، آیت: ۵۹

○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول اور اپنے میں سے اولوا الامر کی اطاعت کرو، پس اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر اور نہایت اچھی تاویل (نیک انجام) ہے)

ان آیات سے اسلام کے معاشرتی طرز تفکر کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اسے کس بنیاد پر استوار کیا ہے۔

مذکورہ بالا مطالب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دین جس طرح اپنی اصل واساس میں اپنے مخصوص معارف الٰہیہ کے تحفظ پر مبنی ہے اسی طرح لوگوں کو طرز تفکر میں مکمل آزادی دیتا ہے، تو اس کا نتیجہ وماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں پر واجب و لازم ہے کہ وہ دینی حقائق میں غور وفکر کریں اور باہمی میل جول اور معاشرتی روابط کے ذریعے تحقیق واجتہاد کر کے دینی معارف سے آگاہی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کریں اور اپنی تمام تر فکری توانائیاں بروئے کار لائیں، اور اگر اس سلسلہ میں انہیں کسی شبہ وغلط فہمی یا غیر واضح صورتحال کا سامنا ہو کہ دینی حقائق ومعارف ان پر آشکار نہ ہو سکیں یا کوئی ایسی چیز سامنے آجائے جو ان معارف وحقائق کے منافی ومتصادم ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اس صورتحال میں وہ کتاب خدا کی طرف رجوع کر کے اپنے معروضی نظریات کی بابت معاشرتی مباحث میں تدبر کے ساتھ کسی نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے، اگر اس طرح بھی اس کی بیماری کا علاج نہ ہو سکے اور وہ اپنی مشکل کا حل نہ ڈھونڈ سکے تو پھر اپنا مسئلہ رسول اللہ ﷺ یا ان کے مقرر کردہ قائم مقام وجانشین کی طرف رجوع کرے تا کہ اس کا شبہ دور ہو جائے یا جو چیز اس کے سامنے آئی ہے اگر وہ غلط وباطل ہو تو اس کا غلط وباطل ہونا ظاہر وواضح ہو جائے، اس حوالہ سے خداوند عالم کا ارشاد گرامی قدر ہے:

سورۂ زمر، آیت: ۱۸

○ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

(وہ لوگ ہر بات سنتے ہیں پھر اس میں سے جو اچھی ہو اس کا اتباع کرتے ہیں، وہی ہیں جو خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں اور وہی عقل و سمجھ والے ہیں)

اور جہاں تک عقیدہ اور فکر و نظر کی آزادی کا تعلق ہے کہ جس کے بارے میں مربوط مطالب واضح طور پر بیان کر چکے ہیں تو اس آزادی سے مراد یہ نہیں کہ جن امور کی بابت شبہ و غیر واضح صورت پیدا ہوا نہیں کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ اور ان کے مقرر کردہ جانشینوں رہبروں کی طرف رجوع کئے بغیر لوگوں میں عام کر دیں کیونکہ ایسا کرنا باطل کی طرف دعوت دینے کے برابر ہے اور اس سے معاشرتی تباہی کے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں جبکہ کتاب اللہ اور رسول ﷺ اور ان کے مقرر کردہ رہبروں کی طرف رجوع کرنا ہی وہ بہترین ذریعہ ہے جس سے معاشرتی امور کی اصلاح اور فکری ارتقاء کے دروازے کھل سکتے ہیں بلکہ اس سے اس شخص کی نجی زندگی کی آسودگی کا تحفظ بھی یقینی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے مقابل یہ کہ لوگوں پر کسی عقیدہ و نظریہ کو مسلط کرنا، دلوں پر پہرے لگانا اور انسانی طبع تفکر کو موت کی نیند سلا دینا ہرگز اور ہرگز دین وحق سے مطابقت نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے والے مادی وسائل کے استعمال اور طاقت کے ذریعے اور کوڑے شمشیر یا کفر کا بازار گرم کرنے اور جلاوطن کر کے اور معاشرتی قطع تعلقی کے ذریعے اپنے عزائم کی تکمیل کو یقینی بناتے ہیں کہ دین اسلام اس طرح کے امور کی ہرگز اجازت نہیں دیتا بلکہ اس پر راضی بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی اس طرح کے افعال کی کسی بھی حوالہ سے حمایت و تائید کرتا ہے ایسا کرنا تو نصرانیوں کی خصلت ہے کہ جن کے اعمال سے چرچ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور ان کی ڈھٹائی و ہٹ دھرمی کی داستانیں بالخصوص پندرھویں و سولہویں صدی عیسوی میں ہونے والے بدترین حالات و واقعات سے ان کے طاغوت صفت حکمرانوں اور جابر و آمر اور سنگدل ارباب اقتدار کی بدباطنی کا ثبوت ملتا ہے کہ جس کی مثال کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔

اس کے ساتھ ساتھ نہایت افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اہل اسلام نے آزادی کی عظیم نعمت کی قدردانی نہیں کی اور فکری یکجہتی و آزادئ عقیدہ کی خدائی عطا کردہ نعمت سے محرومی کا شکار ہو گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اپنے آپ کو ان کثیر نعمتوں سے بھی محروم کر چکے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نوازا اور ہم اپنے فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی و بے توجہی کر کے خداداد نعمتوں سے فیض یاب ہونے سے محرومی کا طوق گلے میں ڈال چکے ہیں۔ اس صورتحال کے ذمہ دار ہم خود ہی ہیں، خداوند عالم نے اس حوالہ سے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

سورۂ رعد، آیت:۱۱

○ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ

(خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے)

ہمارے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسائی کردار ہم پر حاکم ہو گیا اور ہم اس کے اصولوں کو اپنانے لگے جس سے ہمارے دل ایک دوسرے سے جدا ہو گئے (دلوں میں تفرقہ کی آگ شعلہ ور ہو گئی) اور ہم معاشرتی طور پر کمزور پڑ گئے اور گوں

ناگوں مسالک و مذاہب کی منڈیاں سج گئیں، خداوند عالم ہمیں معاف کرے اور غلطیوں وکوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور ہمیں اپنی رضاوخوشنودی کے حصول کی توفیق سے نوازتے ہوئے اپنے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت ورہنمائی فرمائے۔

(۱۵) بالآخر دین حق ہی غالب ہوگا

نوع انسانی میں جو فطرت ودیعت کی گئی ہے وہ اسے اس کی حقیقی سعادت کی طرف دعوت دیتی ہے اور حقیقی سعادت انسان کی روحانی وجسمانی زندگی کی باہم یکجہتی ہی کا نام ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں دینی واُخروی دونوں تقاضوں کو پورا کرے اور دونوں حوالوں سے اپنی حقیقی سعادت کے حصول کو یقینی بنائے، چنانچہ آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں کہ اسلام اور دین توحید یہی ہے، اور جہاں تک ان انحرافات کا تعلق ہے جو انسان کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور اسے اس کے مقصد تخلیق اور منازل کمال تک نہیں پہنچنے دیتے تو اس کی اصل وجہ دین خداوندی کی پاکیزہ تعلیمات کو صحیح صورت میں منطبق نہ کرنا ہے نہ یہ کہ فطرت کے اصولوں میں کسی خامی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے، اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ کارخانۂ تخلیق میں جو ہدف ومقصد متعین ہوا ہے وہ جلدی یا دیر سے بالآخر حاصل ہو کر رہے گا چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

سورۂ روم، آیات: ۳۰ تا ۴۱

- ''فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ '' (آپ اپنا رخ خالص دین کی طرف رکھیں جو کہ فطرت الٰہی ہے کہ جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں یہی پختہ دلیل ہے لیکن اکثر لوگ آگاہی نہیں رکھتے) اس آیت میں لوگوں کے نہ جاننے اور عدم آگاہی سے مراد یہ ہے کہ وہ تفصیلی علم نہیں رکھتے اگرچہ ان کی فطرت اجمالی علم کی حامل ہے ''لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ '' (تاکہ وہ اس کا انکار کریں جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے تم مزے لے لو کہ بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا) ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ '' (لوگوں کے اعمال کے نتیجہ میں بحر وبر فساد کی لپیٹ میں آگئے ہیں تاکہ وہ اپنے بعض اعمال کی سزا چکھیں شاید کہ لوٹ آئیں)۔

سورۂ مائدہ، آیت: ۵۴

- ''فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ''

(بہت جلد اللہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں، جو مؤمنین پر نرم و

مہربان اور کافروں سے سخت سلوک کرتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے)

سورۂ انبیاء، آیت ۱۰۵:

O ''وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝''

(اور ہم نے سب کچھ بیان کرنے کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ میرے نیک و صالح بندے ہی زمین کے وارث ہوں گے)۔

سورۂ طٰہٰ، آیت: ۱۳۲

O ''وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ ۝''

(اور نیک انجام تقویٰ ہی کے لئے ہے)

یہ اور ان جیسی دیگر آیات مبارکہ ہمیں باخبر کرتی ہیں کہ اسلام اپنی مکمل صورت کے ساتھ بہت جلد ظہور پذیر اور پوری دنیا پر چھا جائے گا اور کائنات کے گوشہ گوشہ میں اس کا پرچم لہرائے گا۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ آپ ان لوگوں کی اس بات پر ہرگز کان نہ دھریں جو کہتے ہیں کہ اسلام نے اپنی صورت لوگوں کو دکھادی ہے اور اس کا دورانیہ تاریخ کے معدودے چند ایام سے زیادہ نہ تھا اور اسے استحکام و تسلسل حاصل نہ ہوسکا بلکہ موجودہ تمدن اس پر غالب آ گیا ہے خواہ یہ سب کچھ شعوری طور پر ہوا یا غیر شعوری طور پر! لیکن اس کے کامل ظہور پذیر ہونے اور اپنے تمام تر اصولوں و معارف و مقاصد کے ساتھ انسانی معاشرہ پر حکم فرما ہونے کا خواب ہرگز شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا کیونکہ طبع انسانی اسے قبول نہیں کرتی اور نہ ہی کبھی قبول کرے گی اور نہ ہی کبھی اس کا عملی تجربہ و مثال سامنے آئی کہ جس کی بنیاد پر اس کی کامل حاکمیت کے بارے میں وثوق کے ساتھ توقعات وابستہ کی جائیں۔

اس طرح کے نظریات و اقوال اس لئے قابل توجہ نہیں کہ اسلام اس معنی میں کہ ہم اس کی بابت بحث و گفتگو کر رہے ہیں وہ نوع انسانی کا مقصد اعلیٰ ہے اور اس میں ہی انسانیت کے کمال کی اصل حقیقت پوشیدہ ہے کہ طبع انسانی فطرتاً اس سے مانوس ہے خواہ تفصیلی طور پر اس کی طرف متوجہ ہو یا نہ ہو اس سے اصل حقیقت میں فرق پیدا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام خلقت کائنات کی تمام موجودات کو ان کے مقاصد تخلیق کی طرف کھینچے جا رہا ہے اور نہایت تیزی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے اور انسان اس سے مستثنیٰ نہیں۔

باقی رہی انسانی معاشروں میں گوناگوں طرز ہائے زندگی کی مختلف صورتوں کی بات، تو وہ کسی سابقہ یقینی تجربہ پر مبنی نہ تھیں اور نہ ہی ان کا وجود میں آنا اور معاشروں میں جگہ پانا کسی عملی تجربہ کی بنیاد پر تھا چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ،

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی شریعتوں کی تاریخ اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ وہ ظہور پذیر ہوئیں اور لوگوں میں ان کا سکہ جما، بلکہ برہما و بوذا اور مانی وغیرہ کا بھی یہی حال رہا، اور یہ مادی تمدن و نظام ہائے معاشرت مثلاً ڈیموکریسی، کیمونزم وغیرہ بھی اسی طرح کسی سابقہ تجربہ پر مبنی نہ تھے بلکہ جدید صورت میں سامنے آئے اور مختلف انسانی معاشروں میں جگہ پاتے رہے۔ اصل بات یہ ہے معاشرتی راہ و رسم خواہ اس کا تعلق جس سے بھی ہو اس کے ظہور پذیر ہونے اور معاشرہ میں جگہ پانے کا راز مضبوط ارادوں کے حامل افراد کی بلند ہمتوں اور پختہ عزائم میں مضمر ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد و اہداف کے حصول میں وہ کسی بھی کمزوری و تھکن سے دو چار نہیں ہوتے اور زمانہ کو مقاصد و مرادوں تک رسائی میں حائل و مانع سمجھنا ہرگز درست نہیں اور اسے کاوشوں کے نتیجہ بخش نہ ہونے کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا، اس سلسلہ میں مقاصد و اہداف میں ان کے رحمانی یا شیطانی ہونے کے حوالوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ سب کچھ ارادوں پر منحصر ہوتا ہے۔

روایات پر ایک نظر

صبر و ربط کا مفہوم

کتاب معانی الاخبار میں آیت مبارکہ ''یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا'' کی تفسیر میں منقول ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم مصائب پر صبر کرو، آزمائش پر ایک دوسرے کو حوصلہ دلاؤ اور جس کی پیروی کرتے ہو اس سے وابستگی کو مضبوط کرو) (اصبروا علی المصائب، وصابروهم علی الفتنة ورابطوا علی من تقتدون به) (معانی الاخبار صفحہ ۳۶۹)

اسی آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ ہی سے مروی ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد یہ ہے:

''اصبروا علی دینکم، وصابروا عدوکم ورابطوا امامکم''

(تم اپنے دین پر قائم رہو، اپنے دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہو اور اپنے امام سے وابستہ رہو)

(تفسیر العیاشی جلد اول صفحہ ۲۱۲)

اسی طرح کی روایات کتب اہل سنت میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ سے منقول ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر ''در منثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۱۳)۔

امام صادقؑ کا فرمان

کتاب کافی میں امام صادقؑ سے مروی ہے آپؑ نے ارشاد فرمایا:

''اصبروا علی الفرائض وصابروا علی المصائب ورابطوا علی الآئمہ''

(فرائض وواجبات پر صبر واستقامت کرو، مصائب پر حوصلہ وہمت سے کام لو اور آئمہؑ سے وابستہ رہو)

(اصول کافی، جلد دوم، صفحہ ۸۱)

امام علیؑ کا ارشاد گرامی

تفسیر مجمع البیان میں امام علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: ''رابطوا الصلوات'' یعنی آیت میں ''ورابطوا'' سے مراد یہ ہے کہ نمازوں میں مرابطہ کرو، یعنی نمازوں کے منتظر رہو اور ان کی پابندی کرو۔ (مجمع البیان ج ا۔ ۲، ص ۵۶۲)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی

تفسیر ''درمنثور'' میں ابن جریر اور ابن حیان کے حوالوں سے منقول ہے کہ جناب جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''الا ادلکم علی مایمحو اللہ بہ الخطایا ویکفر بہ الذنوب''

(کیا میں تمہیں اس چیز سے آگاہ کروں جس کے ذریعے خداوند عالم خطاؤں کو محو کرتا ہے اور گناہوں کو معاف کرتا ہے)

قلنا: بلی یارسول اللہ!

ہم نے کہا: ہاں اے اللہ کے رسول!

قال: اسباغ الوضوء علی المکارہ و کثرۃ الخطا الی المساجد وانتظار الصلاۃ بعد الصلاۃ فذلکم الرباط

بھرپور طریقہ سے وضو کرنا جبکہ ناپسندی کیوں نہ ہو، بار بار مسجدوں کو جانا، نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا، کہ یہی مرابطہ ہے۔ (تفسیر ''درمنثور'' جلد ۲ صفحہ ۱۱۴)

اسی تفسیر میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے یہ روایت دیگر اسناد سے بھی ذکر ہوئی ہے، مرابطہ کی فضیلت میں اس قدر کثیر روایات وارد ہوئی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔

ختم شد

سید محمد حسین طباطبائی، (1904-1981ء) علامہ طباطبائی کے نام سے معروف، چودھویں صدی ہجری کے نامور مفسر، فلسفی، اصولی، فقیہ، عارف، اسلام شناس و فکری اور مذہبی لحاظ سے ایران کے بااثر علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ تفسیر المیزان اور بدایۃ الحکمۃ و نہایۃ الحکمۃ، اصول فلسفہ و روش رئالیسم جیسی فلسفی کتابوں کے مصنف ہیں۔ علامہ طباطبائی نے حوزہ علمیہ قم میں فقہ و اصول کے روایتی دروس کے بجائے تفسیر قرآن و فلسفہ کا درس شروع کیا۔ ان کی تفسیری روش، قرآن کی قرآن کے ذریعے تفسیر تھی۔ ان کے بعد حوزہ میں فلسفہ کی تدریس کرنے والوں میں بہت سے ان کے شاگرد تھے۔ ان کے شاگردوں میں شہید مرتضی مطہری، آیت اللہ جوادی آملی، آیت اللہ مصباح یزدی اور شہید بہشتی کو ایران میں چودویں صدی ہجری کے بااثر اور مشہور شیعہ علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ فرانسی فلسفی و شیعہ شناس ہنری کربن کے ساتھ فلسفہ اور جدید مسائل پر علامہ کی نشست و برخاست یورپ میں مکتب تشیع کے تعارف کا سبب بنی۔ علامہ طباطبائی 15 نومبر 1981ء بروز اتوار صبح 9 بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اگلے دن مسجد امام حسن عسکری سے حرم حضرت معصومہ (ع) قم تک ان کی تشییع ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ آیت اللہ العظمی سید محمد رضا موسوی گلپائگانی نے پڑھائی جس کے بعد حضرت معصومہ (س) کے حرم میں مسجد بالا سر میں دفن ہوئے۔